سپریم کورٹ آف پاکستان میں

آخری بیان



ذوالفقار علی بھٹو

آخری بیان

سپریم کورٹ میں شہید بھٹو کے آخری بیان کا

مکمل اُردو ترجمہ

ستّار طاہر

کلاسیک ۔ دی مال لاہور ۳

ناشر .... آغا امیر حسین
کلاسیک دی مال لاہور۳
مطبع .... نفیس پرنٹرز لاہور
کتابت .... غلام مصطفےٰ نوشاہی
قیمت .... [redacted]/- روپے

دیباچہ

وہ زمانہ دور نہیں۔ جب بھٹو پر چلائے جانے والے مقدمہ قتل کا نئے سرے سے جائزہ لیا جائے گا۔ پاکستان کی تاریخ میں انسانی اور سیاسی سطح پر اس مقدمے اور اس کے فیصلے کو جو اہمیت حاصل ہے۔ اس کے پیشِ نظر بدلے ہوئے حالات میں اس مقدمے پر دوبارہ غور و فکر کرنا ناگزیر ہو جائے گا۔

اس حوالے سے بھٹو کا وہ بیان جو ان کا آخری بیان قرار پاتا ہے بہت اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ یہ بیان بھٹو نے سپریم کورٹ کے سامنے چار دنوں میں مکمل کیا تھا۔ بھٹو کا یہ بیان اس اعتبار سے بھی بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ یہ ان کے آخری مستند الفاظ ہیں جو ہم تک پہنچے ہیں۔

اس بیان میں انہوں نے جس انداز سے اپنی صفائی پیش کی وہ اپنی جگہ جاہ و عظمت اور صداقت کا مظہر ہے۔

ان پر چلائے جانے والے مقدمہ قتل اور فیصلے کو سمجھنے کے لیے یہ بیان کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ بیان تاریخی اہمیت کی دستاویز ہے۔ مستقبل میں اس کی اہمیت میں مزید اضافہ ہو گا۔ اردو میں اس یادگار تاریخی بیان کا ترجمہ پہلی بار پیش کیا جا رہا ہے اور اس اعتبار سے کلاسیک نے اس کی اشاعت کا اہتمام کر کے ایک تاریخی فریضہ ادا کیا ہے۔

ترجمہ لفظی انداز میں کیا گیا ہے تاکہ اس کی صحت اور سند پوری طرح برقرار رہے۔

۳۱ مئی ۱۹۸۶ء — ستار طاہر

پہلا دن

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو

"مائی لارڈز میں جانتا ہوں کہ عدالت عالیہ کے آداب اور اخلاقیات کے مطابق میرے لیے یہ ضروری نہیں کہ میں اس معزز عدالت کا شکریہ ادا کروں کہ آج صبح مجھے یہاں عدالت کے سامنے پیش ہونے کی اجازت دی گئی ہے۔ تاہم ملک کے معاشرتی حالات اور جیسا دیس ویسا بھیس کے مصداق میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ مجھے یہ موقع فراہم کیا گیا۔

یور لارڈشپس کے نام اپنی ۱۸ دسمبر والی درخواست میں میں نے یہ استدعا کی تھی کہ میں اس معزز عدالت کے سامنے پیش ہونا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میرے نقطۂ نظر کے مطابق میری زندگی، ایک انفرادی زندگی کی حیثیت سے اس میں ملوث ہے۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ معروضی حالات بھی داؤ پر لگے ہوئے ہیں۔ میری شہرت، میرے خاندان کا وقار، میرا سیاسی مستقبل اور ان سب سے بڑھ کر پاکستان کا مستقبل بھی اس مقدمے میں ملوث ہے۔ یہ میرا نقطۂ نگاہ ہے۔ یہ نقطۂ نظر غلط بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ ایک مخلصانہ اور دیانتدارانہ نقطۂ نگاہ ہے۔ میں اسے ڈرامائی صورت دینا چاہتا ہوں نہ کسی قسم کی مبالغہ آرائی کرنا چاہتا ہوں۔

اپنی اُس درخواست میں میں نے کہا تھا کہ یہ انصاف کے مفاد میں ہوگا اور اسے قابل تعریف سمجھوں گا اگر میری درخواست پر ہمدردی سے غور و فکر کیا جائے۔ ۵ دسمبر کو

یور لارڈ شپس نے ایک حکم کی منظوری دی۔ جس میں یہ کہا گیا تھا کہ یور لارڈ شپس نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اگر ضرورت محسوس کی گئی تو اس اپیل کی سماعت کے دوران مجھے اس معزز عدالت کے سامنے پیش ہونے کا موقع فراہم کیا جائے۔ جناب والا نے میری بنیادی درخواست پر ہی فیصلہ دیا۔ اور اس کا کوئی تعلق مقدمے کی کارروائی میں جو تبدیلی آئی اس کے ساتھ نہیں تھا۔ جس کے نتیجے میں مجبوری کے تحت جسٹس وحید الدین کی اس بنچ سے علیحدگی ہوئی یور لارڈ شپس نے، جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، اپنے اس حکم میں یہ اشارہ دیا تھا کہ آپ میری سماعت انصاف کے مفاد میں کریں گے۔ اور میں ہر موضوع پر اظہار خیال کر سکتا ہوں آپ نے اس توقع کا اظہار کیا تھا کہ وہ نکات جن پر پہلے سے گفتگو ہو چکی ہے۔ میں ان نکات کا انتخاب نہیں کروں گا۔

اب میں یور لارڈ شپس کو قطعی انداز میں یہ یقین دلانا چاہوں گا کہ میں ان نکات پر بات نہیں کروں گا۔ جن پر اس سے پہلے بات ہو چکی ہے۔ لیکن اگر میں اس کے باوجود اس گھسے پٹے راستے پر چل نکلوں تو یہ اس لیے ہوگا کہ میں ان تمام امور اور باتوں سے پوری طرح واقف نہیں ہوں، جو اس عدالت میں کہی جا چکی ہیں۔ میں موت کی کوٹھڑی جس کا رقبہ ۷×۱۰ فٹ ہے میں ایک برس سے زائد عرصے سے بند ہوں۔ جس کے نتیجے میں میں اس کمرے میں اپنے آپ کو دھندلایا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اس کمرے میں اپنی موجودگی کو اس کے رکھ رکھاؤ اور اس میں موجود لوگوں میں اپنے آپ کو پوری طرح ایڈجسٹ نہیں کر سکتا ہوں۔ لوگوں کو دیکھنا بہت نفیس اور اچھا لگتا ہے۔ اس لیے میں اس سماعت اور موجودگی میں کچھ سست رو ہو گیا ہوں۔

میں اس معزز عدالت میں ان افراد کے سامنے جو غیر ملکی ہیں۔ اس حقیقت کا تذکرہ کرنا نہیں چاہتا کہ مجھ پر کیا کچھ گزر چکی ہے۔ میں ان غیر ملکی دوستوں کا احترام کرتا ہوں۔ میں اپنے جسم پر نشانات یا ایسی چیزوں کو ان کے سامنے دکھانا نہیں چاہتا۔ لیکن میں یہ کہنا چاہوں گا کہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اور اگر اس مرحلے میں اس سرزمین سے تجاوز کر جاؤں۔ جو پہلے سے ہی ڈھانپی جا چکی ہے تو میں ایسا بری نیت سے نہیں کروں گا کہ میں عدالت عالیہ کا وقت ضائع

کرنا چاہتا ہوں۔ تاہم میں اپنی موت کی چھوٹی سی کوٹھڑی سے وہ جبر اور مجبوریاں دیکھ سکتا ہوں، جو اس کیس کے خاتمے کے لیے عمل میں لائے گئے ہیں۔ یہ جبری عوامل مجھ پر اسی طرح واضح ہیں۔ جیسے میں ایک پینوراما دیکھ رہا ہوں۔

میں آپ کو دوسری یقین دہانی یہ دلانا چاہتا ہوں کہ میں کسی ادارے کو بھی سیکنڈ لائز کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ جیسا کہ ایک اخبار میں اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس اخبار نے یہ رائے صحیح دی ہے۔ لیکن میں اس سے کسی حد تک محظوظ ضرور ہوا۔ حقیقی بات تو یہ ہے کہ بھلا میں ان اداروں کو سیکنڈ لائز کیوں کروں گا، چند قیمتی ادارے ہی تو باقی رہ گئے ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ میرا اس ملک کے اداروں کے ساتھ بہت گہرا تعلق رہا ہے۔ میں نے ان اداروں کی تعمیر کے لیے کوشش کی ہے۔ میں نے انہیں کبھی تباہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میں یہ گستاخی کرنے کی جسارت پسند نہیں کروں گا کہ میں ۱۹۷۳ء کے آئین کا خالق ہوں۔ تاہم ماضی میں، حتیٰ کہ جب غیر جمہوری آئین منظور کیے گئے تو انہیں چوہدری محمد علی کے آئین اور ایوب خان کے آئین کا نام دیا گیا۔ اس حوالے سے اس آئین کو اگر ذوالفقار علی خان بھٹو بہت بلند آہنگ سمجھا جائے تو اسے زیڈ اے بھٹو کے آئین کا نام دیا جا سکتا ہے۔

میں نے ان اداروں کے فروغ اور نشوونما میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یور لارڈ شپس کو یاد ہو گا کہ جب میں پاکستان کا صدر تھا اور آپ حمود الرحمان کمیشن کے ارکان تھے تو چیف جسٹس حمود الرحمان کمیشن چاہتا تھا کہ وہ گواہی ایوان صدر میں ریکارڈ کریں۔ میں نے فوراً اپنے خصوصی نائب کے ذریعے ایک پیغام بھجوایا تھا کہ میں یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ہمارے ملک پاکستان کے چیف جسٹس اور ہائی کورٹ کے جسٹس میرے پاس آنے کی کوشش کریں یہ میری ڈیوٹی ہے کہ میں خود کمیشن کے پاس جاؤں اور میں اس بات کو صحیح نہیں سمجھتا کہ کمیشن محض اس لیے میرے پاس خود آئے کہ میں پاکستان کا پہلا منتخب صدر ہوں۔

یور لارڈ شپس میں یہاں اکتوبر ۱۹۷۷ء میں پیش ہوا۔ جب یور لارڈ شپس بیگم نصرت بھٹو کی آئینی درخواست پر غور فرما رہے تھے۔ ایک یا دو ججوں کے علاوہ باقی آپ سب اس بنچ میں شامل تھے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ جب بھی کسی معزز جج نے مجھے کہا کہ میں کسی خاص نکتے

پر بات نہ کروں تو میں نے فوراً وہ نکتہ چھوڑ دیا۔ جب فیصلہ دیا گیا تو میں اس وقت کوٹ لکھپت جیل میں ایک زیرِ سماعت قیدی کی حیثیت سے بند تھا۔ اور ماضی کی طرف رجوع کرتے ہوئے موجودہ سماجی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے میں کہتا ہوں کہ یہ ایک مثبت فیصلہ ہے۔ میں نے کہا تھا کہ یہ ایک بہت دشوار اور مشکل فیصلہ تھا۔ کیونکہ ایک طرف دوسو کیس کی نظیر اور ورثہ اور دوسرے امور تھے اور دوسری طرف منتخب لوگوں کا آئین تھا۔ ایک جمہوری آئین، ایک متفقہ آئین، اس میں ایک واٹا میڈی، ایک موڈس وائیونڈی کو مارشل لا کے سماجی حالات ہی سے تلاش کیا جاتا تھا۔ اس اعتبار سے یہ فیصلہ بہت مثبت تھا۔

تاہم میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ فیصلہ ایک قیمتی اضافہ ہوتا — اگر اس میں دو پہلو اور عناصر مزید شامل کر لیے جاتے۔

پہلی بات یہ ہے کہ معزز عدالت کو ملک میں انتخابات کے لیے ایک مدت مقرر کر دینی چاہیے تھی۔ میں معذرت خواہ ہوں کہ یہ بات میں تب نہ کہہ سکا جب میں عدالت کے سامنے پیش ہوا تھا۔ میں عجز و انکسار کی وجہ سے جان بوجھ کر اس مسئلے کو چھونا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے خیال تھا کہ یور لارڈ شپس کہیں اس سے غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائیں۔ میں وقت کے تعین، میعاد کے پہلو کی تجویز اس خیال سے پیش کر رہا ہوں کہ میں اس سے اپنی پارٹی اور انتخابات کے نتائج کے حوالے سے کوئی ذاتی فائدہ چاہتا ہوں۔ اسی لیے میں براہ راست بات کرنے کی بجائے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ یہ غالباً جسٹس شاہ اور مسٹر جسٹس دراب پٹیل تھے۔ جنہوں نے کہا، کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم وقت کا تعین کر دیں۔" میں نے جواب دیا بالکل ....." ہاں میں نے بالکل کا لفظ ہی کہا تھا۔

دوسری بات جو میں کہنا چاہتا تھا وہ یہ تھی کہ اگر آئین میں ترمیم کی اجازت فراہم کر دی گئی تھی تو ان ترامیم کو پابند کر دیا جاتا۔ تاکہ بنیادی میکانکی ضرورتوں اور ملک کے نظام کو چلانے کے لیے کافی ہوتا۔ یہ پابندی لگا دی جاتی کہ انتہائی ضرورت کے تحت ہی جنکے بغیر ملک نہ چلایا جا سکے۔ آئین میں ترامیم کی جائیں۔ یعنی اتنی ہی ترامیم جو مارشل لا کے نظام کی راہ میں رکاوٹیں بن سکتی تھیں۔ ان کی ترمیم کی اجازت فراہم کی جاتی۔ آئین میں اندھا دھند ترامیم کی اجازت فراہم نہیں کرنی چاہیے

تھی۔ آپ نے آئین میں ترمیم کے لیے اس اندھا دھند طریقے کی حقیقت میں اجازت نہیں دی تھی کیونکہ آپ نے نظریہ ضرورت کی وضاحت اور تعریف پیش کر دی تھی اور حقیقت میں اسی تعریف کے تحت آئین میں ترمیم ہونی چاہیے تھی۔

اس فیصلے کے متعلق میرا تمیسرا مشاہدہ اور رائے یہ ہے کہ یہ فیصلہ بہت نازک اور دقیق سنجیدہ اور صاف ستھرا ہے۔ اس لیے موجودہ مارشل لا حکومت اس سے پورا فائدہ نہیں اٹھا سکی بلکہ وہ اس کو بے معنی اور بے کار بنا کر رکھ دے گی۔ کیونکہ اس فیصلے نے قانونی اور آئینی امور کو پیش منظر نہیں رکھا اور اس نے سلیٹ کو پوری طرح صاف نہیں کیا۔ یور لارڈ شپس وہ دلائل جو یہاں آپ کو غیر جانبداری اختیار کرنے اور مارشل لا کو استحقاق و استحکام بخشنے کے لیے استعمال کیے گئے۔ دراصل ان کا عملی اظہار ہونا چاہیے نہ کہ محض ان کو بیگم نصرت بھٹو کیس کے درمیان ہی زبانی طور پر اپنایا گیا تھا۔

ان وجوہات کی بنا پر جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے میری خواہش تھی کہ میں اپنے بعض نکات کو تفصیل سے بیان کرتا۔ چونکہ میں نے خود ہی ایسا نہیں کیا۔ اس لیے میں اپنے آپ کو ہی مورد الزام ٹھہراتا ہوں۔ کیونکہ میری یہ پوزیشن تھی کہ میں انتظامی امور اور پہلوؤں کو حالات کے مطابق سمجھتا تھا اور قانونی پہلوؤں سے بھی آشنا تھا۔ میں معذرت خواہ ہوں کہ میں نے اس معزز عدالت کے سامنے اپنے نکتہ نظر کو تفصیلی انداز میں پیش نہ کر سکا۔

یور لارڈ شپس کو یاد ہو گا کہ اس مختصر سے وقت میں جو ایک گھنٹہ یا اس سے قریب تھا، میں نے یور لارڈ شپس کے سامنے اپنی بعض آراء پیش کی تھیں اور یور لارڈ شپس از راہ عنایت میری تائید کریں گے کہ میری آرا وقت گزرنے کے ساتھ صحیح ثابت ہوئی ہیں۔ میں نے یور لارڈ شپس کو بتایا تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ سیاسی جماعتوں کو ختم کیا جائے گا اور سیاسی جماعتیں توڑ دی جائیں گی۔ میں نے یور لارڈ شپس کو بتایا تھا کہ جب آئین کی چھتری نہیں ہو گی تو پھر آئین کے خلا میں ہونے کی وجہ سے قومیتوں کے مسائل اُٹھ کھڑے ہوں گے۔

پاکستان ایک فیڈریشن تھا۔ لیکن اب یہ ایک فیڈریشن نہیں رہا۔ اب اسے ایک ہی ہاتھوں میں دی جانے والی حکومت کے انداز میں چلایا جا رہا ہے۔ مائی لارڈ، ہم فیڈریشن کے اجماع پر بحث

بہت دشوار، کٹھن اور تکلیف دہ مرحلے سے گزر کر پہنچے تھے۔ اب مصائب کے صندوق کا ڈھکنا کھل گیا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ جو قومی فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔ وہ حاصل نہیں کیا جا رہا۔ اور مَیں تو یہاں تک کہوں گا کہ قومی مفاد کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ خالص معروضی اصطلاح میں کہوں گا کہ مجھے صورت حال دیکھ کر بے حد تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ کہ سیاسی جماعتوں کی جس انداز میں "نسل کشی" کی جا رہی ہے۔ پارٹیاں ہی ملکی رابطے ہوتے ہیں۔ اگر ان قومی رابطوں کو کمزور یا سخت کر دیا جائے تو پھر قومی ڈھانچہ کبھی برقرار نہیں رہ سکتا۔ مثال اور موازنے کے لیے، مسز اندرا گاندھی ہی کو لیجیے، جو اتر پردیش میں نعرے لگاتی اور پسند کی جاتی ہے۔ اور مدراس جا کر وہاں انتخاب میں حصہ لے کر ستر ہزار ووٹوں کی اکثریت سے کامیاب ہوتی ہے۔ اگر ایک ملک میں قومی جماعت نہ ہو تو پھر کسی رہنما کے لیے ایسا ممکن نہیں ہوتا۔ خواہ وہ رہنما کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو — انفرادی طور پر اس کے لیے اتر پردیش میں جانا اور مدراس سے انتخاب لڑ کر کامیاب ہونا ممکن نہیں ہو سکتا۔

یہاں پاکستان میں ان قومی اداروں کو توڑا اور جکڑا گیا ہے۔ اور ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ وہ بیج بو دیا گیا اور نشو و نما پانے لگا ہے۔ اگرچہ ابھی وہ پوری طرح کھلا نہیں۔ لیکن چار قومیتوں کا مسئلہ انتہائی تیزی سے پھل پھول رہا ہے۔ اگر انتخابات کے لیے کسی مدت کا تعین کر دیا جاتا تو موجودہ صورتحال جس کا آغاز تب سے ہوا ہے کبھی اتنی خطرناک صورت اختیار نہ کرتی۔ اب جبکہ آئین میں بہت سی ترامیم کی جا چکی ہیں اگر کبھی انتخابات ہوئے بھی تو پھر یہ سوال ضرور اٹھے گا جو اسمبلی معرضِ وجود میں آئی ہے۔ وہ ایک آئینی اسمبلی ہے یا ایک قومی اسمبلی۔

تیسری بات جو مَیں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ میں کسی بھی خاص فرد کی رسوائی یا سیکنڈلائز کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ میں جناب والا کے سامنے اس لیے پیش نہیں ہوا کہ کسی کو سیکنڈلائز یا ہراساں کروں۔ یہ قطعی طور پر میرا مقصد نہیں ہے۔ اصل مسائل بہت گھمبیر ہیں اور ان پر جو داؤ لگا ہے اور بہت اونچا ہے۔ تاہم میں ان چند نکات پر ضرور کچھ کہوں گا۔ جنہیں ہائی کورٹ کے فیصلے میں اٹھایا گیا ہے۔ یہ مقدمہ بہت طویل عرصے تک چلا ہے۔ اس کا فیصلہ کوئی ۴۰۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ معطلیاں اور شہادتیں ہیں۔ مَیں ان کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا ہوں

لیکن اس فیصلے میں بعض ایسی آرا دی گئی ہیں جو میری ذات سے تعلق رکھتی ہیں اور میں اسے اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ ان آرا پر اس وقت اظہار خیال کروں جب کہ میں آپ کے سامنے پیش ہوں۔

مثلاً میرے بارے میں کہا گیا ہے کہ میں محض نام کا مسلمان ہوں۔ یہ ایک ایسی بات ہے کہ جس میں کوئی بھی نمائندہ خواہ کتنا ہی ممتاز کیوں نہ ہوں، مبالغہ یا اس میں کمی کر سکتا ہے۔ خدا مجھے معاف کرے، اگر میں جسٹس صفدر شاہ سے کہوں کہ وہ ایک پختون نہیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ انہیں یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس بارے میں اپنی رائے کا اظہار کریں کہ وہ پختون ہیں یا نہیں، اور پھر مائی لارڈ، ایک پختون، ایک سندھی یا ایک پنجابی یا بلوچی ہونا اتنا اہم نہیں ہے کہ جتنا کہ مسلمان ہوگا نا جس سے کسی شخص کے ایمان، عقیدے، مذہب اور دین کا تعلق ہوتا ہے۔

میری شخصیت کے بارے میں اس رائے کے حوالے سے ایک ضمنی نکتہ بھی پیدا ہوتا ہے جو میرے مزاج، میرے کردار، اور میری اس استعداد کے متعلق ہے کہ میں کس حد تک اہانت برداشت کر سکتا ہوں۔ مائی لارڈ، سرکاری وکیل نے لاہور ہائی کورٹ میں اپنے دلائل کو سمیٹتے ہوئے اس شدید خیال کا اظہار کیا۔ لاہور ہائی کورٹ میں بار بار غیر ضروری طور پر مجھے اہانت کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ سرکاری وکیل نے اپنے دلائل کا خلاصہ پیش کرنے کے بعد کہا "مائی لارڈز جب میں گورنمنٹ کالج لاہور میں ایک طالب علم تھا تو وہاں انگریزی کے ایک اُستاد تھے۔ جن کا نام پروفیسر ڈکنسن تھا۔ ایک بار وہ پروفیسر ڈکنسن کے پاس گئے اور پروفیسر ڈکنسن کو بتایا کہ ان کا کسی سے جھگڑا ہو گیا ہے۔ کیونکہ اس لڑکے نے اس کی بے عزتی کی تھی۔ تیس برس پہلے کا واقعہ اگر سرکاری وکیل کو یاد آیا اور اسے دہرا رہے تھے تو اس کا کوئی معقول سبب بھی تھا۔ سرکاری وکیل نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا تھا " مائی لارڈ کیا آپ جاننا چاہتے ہیں کہ پروفیسر ڈکنسن نے اس طالب علم کو کیا جواب دیا تھا۔ پروفیسر ڈکنسن نے کہا تھا۔ کیسی بے عزتی؟ ایک جنٹل مین کی کبھی اہانت نہیں کی جا سکتی۔"

" پروفیسر ڈکنسن کی یہ کہانی سنانے کے بعد سرکاری وکیل نے میری طرف دیکھا اور سب لوگ میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے اس میں اپنی بے عزتی محسوس کی۔ کیونکہ میں جنٹل مین نہیں تھا تاہم میں مسکرا دیا تھا۔ کیونکہ میرے دل میں انگریزوں کے لیے بڑا احترام ہے اور پروفیسر ڈکنسن

نے جو کچھ کہا تھا۔ وہ خالصتاً ایک انگریزی رویہ اور انداز تھا۔ وہ اسی انداز میں اپنی نوآبادیوں کے باشندوں کو بتایا کرتے تھے کہ انہیں ذلیل اور بے عزت ہونے کا کوئی حق حاصل نہیں کیونکہ جو لوگ آزادی کھو چکے ہیں۔ انہیں یہ مطلق حق حاصل نہیں کہ وہ جنٹل مین ہونے کا دعوے کر سکیں۔ مائی لارڈ، جہاں تک انگلستان کا تعلق ہے۔ وہاں عہد شجاعت کے اصولوں کے تحت جو بادشاہ آرتھر کے زمانے سے چلے آرہے ہیں۔ اگر کسی جنٹل مین کی اہانت کر دی جائے تو ڈوئل تک لڑا جاتا تھا۔ تاکہ اپنی عزت اور وقار کا تحفظ کر سکے۔ جنٹل مین کبھی اہانت برداشت نہیں کرتے نوآبادیوں کے کسی باشندے سے البتہ یہ توقع نہ کی جاتی تھی کہ وہ اپنی توہین محسوس کرے۔

"مائی لارڈ، جنٹل مین کے بارے میں اس گفتگو سے کہ اس کی اہانت ہو ہی نہیں سکتی، مجھے ایک دوسری انگریزی ترکیب الفاظ یاد آرہی ہے، جسے برطانیہ والوں نے ڈھالا تھا" اوہ نہیں۔ وہ تو بکواس (LOOSE TALK) تھی۔" اس ترکیب الفاظ کا منبع بھی نوآبادیاتی دور ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ بعض اوقات کوئی برطانوی افسر میس میں کسی ہندوستانی افسر کی بے عزتی کر دیتا تھا۔ جب وہ ہندوستانی افسر اپنے برطانوی افسران بالا سے اس کی شکایت کرتا تو اسے کہا جاتا۔" اوہ چھوڑو اسے معاف کر دو کپول سنگھ، یا اسے بھول جاؤ۔ ارشاد وہ تو بکواس کر رہا تھا۔" یوں مقامی لوگوں کو یہ تلقین کی جاتی ہے کہ وہ اپنے برطانوی افسروں کی زیادتیوں کو نظر انداز کر دیا کریں۔

اس لیے مائی لارڈ، یہ تو تشریحات کا مسئلہ ہے۔ مائی لارڈ، میں ایک مختلف مثال پیش کرنا چاہوں گا۔ جب میں کرائسٹ چرچ میں داخل ہوا تو وہاں پروفیسر ٹریور ہوپر سینیئر گائیڈنس کونسلر تھے۔ جب میں ان سے پہلی بار ملاقات کے لیے گیا تو انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں کس مضمون کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں جورس پونڈنس اور قانون کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں میں نے یہ بھی بتایا کہ میں ریاست ہائے متحدہ سے بھی اس مضمون میں درجہ اوّل کا امتحان پاس کر چکا ہوں۔ اس لیے میں یہ استحقاق رکھتا تھا کہ اپنی تعلیم دو سالوں میں پوری کروں۔ جبکہ یہ کورس عموماً تین برس کا ہوتا تھا۔ پروفیسر ٹریور ہوپر نے پوچھا کیا مجھے لاطینی آتی ہے۔ میں نے نفی میں جواب دیا تو انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اپنا کورس دو برسوں کی بجائے تین برسوں میں ہی مکمل کروں۔ لاطینی ایک لازمی مضمون تھا اور اگر میں رومن لا میں فیل ہو جاتا تو مجھے فیل سمجھا جاتا۔ اب بھلا یہ کون نہیں چاہتا کہ وہ آکسفورڈ

میں مزید ایک سال گزارے، سو مَیں رضامند ہو گیا۔ لیکن جب میں وہاں سے جانے لگا تو انہوں نے مخاطب کر کے کہا "حتیٰ کہ ہمارے اپنے ملک کے بہترین دماغ رکھنے والے لڑکے بھی یہ امتحان دو برس میں پاس نہیں کر سکتے۔" مَیں مڑا اور کہا، اب مَیں یہ کورس دو برس میں ہی مکمل اور پاس کروں گا۔ کیونکہ اس نے جو بات کہی وہ میرے دل کو کھا گئی تھی۔ مَیں نے انہیں بتایا کہ مَیں یہ ثابت کروں گا کہ میرا ذہن ذہین انگریز طالب علموں سے اگر بہتر نہیں تو کمتر بھی نہیں ہے۔ مائی لارڈ مَیں نے یہ امتحان دو برس میں پاس کر کے دکھا دیا۔ اور جورس پانڈس میں اعلیٰ امتیاز بھی حاصل کیا۔ جس میں رومن لا بھی شامل تھا۔

مائی لارڈ، کسی شخص کا اہانت کے بارے میں ردِعمل اس کا داخلی مسئلہ ہوتا ہے۔ میری ایسی تربیت نہیں ہوئی کہ مَیں لوگوں کی بے عزتی کروں۔ میں ایک مہذب اور تعلیم یافتہ انسان ہوں۔ مَیں لوگوں کی اہانت نہیں کرتا اور دوسروں سے بھی اس کی توقع نہیں رکھتا کہ وہ بلا جواز میری بے عزتی کریں۔ میری بلا جواز بار بار بے عزتی کی گئی۔ جس کا ذکر میں بعد میں کروں گا۔ جب میں نے اس بے عزتی کو صاف کرنا چاہا جو بلا وجہ مجھ پر تھوپی جا رہی تھی اور مَیں نے اس حوالے سے بنیادی سوال کیا تو سرکاری وکیل نے جواب میں پروفیسر ڈکنسن کی مثال پیش کر دی۔ خیر، مائی لارڈ، جب مَیں بول رہا تھا تو سرکاری وکیل نے کوئی بے عزتی محسوس نہ کی۔ کیونکہ وہ ایک جنٹل مین ہے۔

اب مَیں سماجی اور معاشرتی حالات کے بارے میں بات کرنا چاہوں گا۔ کیونکہ اسے بھی ایک مسئلہ بنایا گیا ہے کہ جس وقت میں پاکستان کا صدر اور وزیر اعظم تھا تو اس وقت پاکستان کے معاشرتی اور سماجی حالات بدتر تھے۔ اس کیس میں ہر وہ معاملہ جس میں ثبوت پیش کرنے کے امکانات قطعی طور پر نہ ہوتے تھے۔ وہاں ٹیلی فون اور سماجی حالات کا ذکر شروع کر دیا جاتا تھا۔ اس مقدمے میں ٹیلیفون نے میرے خلاف سب سے بڑے پراسکیوٹر کی حیثیت حاصل کر لی۔ بلکہ اس مقدمے میں ہی نہیں بلکہ وائٹ پیپر میں بھی۔ جب کوئی ثبوت پیش کرنا ممکن نہیں تھا تو ٹیلی فون کو کردار ادا کرنے کے لیے بیچ میں لے آیا گیا۔ اس ملک کے رہنما کو سزا دینے کے لیے، اسے قاتل ثابت کر کے موت کی سزا دینے کے لیے ٹیلی فون کو اس کے خلاف قوی ترین آلے کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے کہ اس کے ذریعے ظلم کیا گیا اور اسے ہی یقینی اور حقیقی شہادتیں جمع کرنے کا ذریعہ بنا دیا گیا۔

دوسری طرف اس زمانے کے معاشرتی اور سماجی حالات کا ذکر کر کے اس کے نیچے پناہ لی جاتی ہے۔ مسٹر بھٹو کے زمانے میں ظلم و ستم اور آمریت کا بازار گرم تھا۔ لوگ مسٹر بھٹو سے دہشت زدہ تھے۔ مائی لارڈ، کوئی شخص دونوں راستے کس طرح اختیار کر سکتا ہے۔ ایک طرف تو میرے زمانے میں آمریت اور ظلم و تشدد تھا اور دوسری طرف ہر طرح کے بیانات اور تقریریں کیے جا رہے تھے۔ اسے کسی صورت فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اس زمانے میں جمہوریت موجود تھی۔ اور جیسا کہ راؤ رشید نے اپنے بیان حلفی میں کہا ہے کہ جمہوری اور شہری دور حکومت میں حالات کیسے بھی کیوں نہ ہوں۔ ان کا موازنہ مارشل لاء کے زمانے کے حالات سے نہیں کیا جا سکتا۔

مائی لارڈ، اگر ایس ایچ او عبدالحئی نیازی، شفیع الرحمان ٹربیونل کے سامنے کہتا ہے اور اپنی گواہی بدلنے کا فیصلہ کر سکتا ہے تو اس کا کونسا تعلق میرے زمانے کے مروّجہ بدتر حالات سے بنتا ہے؟ اس معزز عدالت میں یہ بات بار بار کہی گئی ہے کہ کیس فائل کرنے کے بعد عبدالحئی نیازی چوبیس گھنٹوں کے اندر ناکارہ اور مغلوب ہو کر رہ گیا۔ اگر ایسا ہوا بھی ہو تو میں اب بھی یہ کہوں گا کہ اس کی ذمہ داری مجھ پر عائد نہیں کی جا سکتی ہے۔ میرا نیازی کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ نیازی کون تھا۔ اور اگر وہ کیس فائل کرنے کے چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر ناکارہ بن گیا تو پھر اس کا یہ ناکارہ پن صدیوں سے رائج حالات کا نتیجہ ہے نہ کہ میں اس کا ذمے دار ہوں۔ مائی لارڈ تضاد خود اپنے آپ بول رہا ہے۔ استغاثہ کے گواہ نمبر ۱۲ محمد اصغر نے کہا کہ اس نے ایف۔ آئی۔ آر میں نام کو مٹا دیا۔ اس کے باوجود اسی رات تین گھنٹوں کے اندر اندر میرا نام پھر ایف۔ آئی۔ آر میں درج کر دیا گیا۔

اگر یہ ماتحت پولیس افسران ایف آئی آر میں وزیر اعظم کا نام درج کرنے سے ہچکچا رہے تھے تو میں اس سے باخبر نہیں تھا۔ اگر آج چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا نام ایک مقدمہ قتل میں درج کیا جا رہا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ ماتحت افسران کا پہلا ردّ عمل یہ ہو گا کہ وہ اسے سنجیدگی سے نہیں لیں گے۔ وہ اس پر غور کریں گے یا کم از کم اپنے حکام بالا سے اس سلسلے میں مشورہ کریں گے۔ بہر حال کسی عام آدمی کا نام تو درج نہیں کیا جا رہا۔ اس لیے اگر اس وقت کسی قدر ہچکچاہٹ کا مظاہرہ اس سطح پر ہوا تو پھر اسے کس طرح سے غیر فطری قرار دیا جا سکتا ہے؟

اس کے ساتھ یہ بھی دیکھیے کہ ایک سینئر افسر، ایس ایس پی نے عدالت عالیہ لاہور میں بڑے فخر سے کہا کہ اس نے قصوری سے کہا کہ وہ اپنا بیان تحریری شکل میں دے اور تحریری بیان کا وہ مسودہ جسے قصوری کے ایک دوست نے تیار کیا تھا۔ قبول کر لیا گیا۔ قصوری کی ذہنی حالت اس وقت ٹھیک نہیں تھی اسی لیے مسودہ اس کے دوست نے تیار کیا۔ پھر وکیل خان آتا ہے اور بتاتا ہے کہ ایف آئی آر فی الفور براہ راست درج کر لی گئی تھی۔ اور نیازی سے یہ کہا گیا تھا کہ وہ جائے واردات پر جائے اور خالی کارتوس جمع کرے۔ ان شہادتوں میں کوئی ایسی بات دکھائی نہیں دیتی کہ جسے پیش نظر رکھ کر کہا جائے کہ افسران نے قانون کے تقاضوں کو پورا نہیں کیا تھا۔

اس کے باوجود، اس کے پہلو بہ پہلو بار بار ایسے دلائل دہرائے جاتے ہیں جن کا تعلق، مروجہ سماجی حالات سے تھا۔ اگر آپ نے سماجی حالات کو ہی پیش کرنا ہے تو کم از کم اس میں تو اصرار و استحکام ہونا چاہیے۔ آپ سماجی حالات کو پسندیدہ اور ناپسندیدہ نہیں بنا سکتے کہ آپ اپنے مفاد کے لیے تو سماجی حالات کو پسندیدہ بنا لیں اور پھر اپنے سماجی حالات کو اپنے خلاف بھی قرار دیں۔

اس کے بعد مائی لارڈ میں محرک یا جواز کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اگر یور لارڈشپس مجھے کسی حد تک اجازت دیں تو میں اس سازش اور اس کے متعلقہ رویے کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ مائی لارڈ، آپ خود ملاحظہ فرما سکتے ہیں کہ لائی کورٹ کے فیصلے میں باطنی اور شدید اختلافات اور تضادات موجود ہیں اور اسے دونوں طرح سے دیکھا جائے تو میں نے گہرے راسخ تضادات کو پایا ہے۔ اس فیصلے میں جرم کے محرک اور جواز کے حوالے سے بتایا گیا کہ خاص فرد ایسی تقریریں کیا کرتا تھا۔ جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ زہریلا اور تلخ نقاد تھا۔ اور یہ کہ ان تقریروں میں جو کچھ کہا جاتا تھا جھوٹ تھا تو بھی میرا مشتعل ہو جانا فطری تھا اور میں یہ پسند کرتا تاکہ اس کا صفایا کر دیا جائے اور جو کچھ وہ تقریروں میں کہتا تھا اگر سچ تھا تو بھی میں یہی پسند کرتا تاکہ اس کو ختم کر دیا جائے۔ میرے لیے کھڑے ہونے کے لیے کوئی جگہ نہیں چھوڑی گئی۔ سوال یہ ہے کہ جو کچھ ان تقریروں میں کہا گیا تھا اگر وہ غلط بیانی اور جھوٹ تھا تو

پھر بھلا میں کیوں مشتعل ہوتا؟
مائی لارڈ، میں ایک سیاستدان ہوں۔ یہ کوئی پہلا موقع نہیں تھا کہ میں اسمبلی میں گیا تھا میں اسمبلی میں گذشتہ بائیس برس سے ہوں۔ مجھے کئی بار اس کا رکن منتخب کیا گیا اور ۱۹۷۰ء میں ہی مجھے پانچ بار اسمبلی کے لیے منتخب کیا گیا۔ سندھ کی امپریل کونسل میں ۱۹۲۱ء میں ہونے والا پہلے نمائندے تھے۔ جب وہ بمبئی کی قانون ساز اسمبلی میں مسلمانوں کے رہنما کی حیثیت سے گئے تو میرے چچا سندھ کے نمائندے بن گئے۔ اس لیے مائی لارڈ ہم اسمبلی میں چیمسفورڈ مانٹیگو اصلاحات کے زمانے سے اسمبلی میں ہیں۔ اس لیے یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ میں نے اپنے خلاف اسمبلی میں تنقید و تعریض سنی۔ میں ایک لڑکے کی حیثیت سے ان اسمبلیوں میں جاتا رہا۔
میں خود تلخ اور زہریلے حملوں کا سامنا ۱۹۶۲ء سے کر رہا ہوں۔ جب قومی اسمبلی کا رکن بنا تھا اور یور لارڈشپس اس اسمبلی میں ہی دوسرے لوگوں کی تنقید جو مجھ پر کی گئی کہیں زیادہ تلخ زہریلی اور جارحانہ تھی۔ اس لیے یہ کسی طرح نہیں کہا جا سکتا کہ سیاست کے میدان میں میں پتلی اور نرم جلد کا مالک تھا اور یہ کہ میں کوئی ایسا شخص تھا جو مختلف پیشوں سے وابستہ رہنے کے بعد اپنی حدود سے تجاوز کر کے سیاست کی دنیا میں آگیا تھا اور میں تلخ تنقید کے طوفان کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا تھا۔ مائی لارڈ ایسا کسی غیر سیاسی شخص کے ساتھ تو ہو سکتا ہے۔ لیکن کسی سیاسی شخص کے بارے میں ایسا نہیں کہا جا سکتا۔ ایک ایسا سیاستدان جسے عوام نے شاندار اور بھاری اکثریت کے ساتھ منتخب کیا ہو۔ ایک غیر متحمل شخص سیاست میں کبھی بھاری اکثریت کے ساتھ منتخب نہیں ہو سکتا۔ صرف وہی شخص منتخب ہوتا ہے جو متحمل ہو۔ جسے لوگ پیار اور پسند کرتے ہوں۔

مائی لارڈ میرے بارے میں یہ بھی کہا گیا کہ میں ایک مستبد ظالم، ایک ڈکٹیٹر اور ایک ہٹلر تھا۔ حال ہی میں سنا گیا کہ ایک شخص نے اپنے آپ کو فاشسٹ کے سانچے میں ڈھال لیا ہے۔ ہٹلر ایک فاشسٹ تھا لیکن اس نے کبھی اپنے آپ کو رائیٹسٹ نہیں کہا۔ لیکن میں ایک ایسا شخص ہوں جسے ہٹلر کہا گیا ہے۔ مائی لارڈ لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے میں ایک حوالہ اس ضمن میں ہے۔ جو آپ کے غور و فکر کا طالب ہے۔

ایک معزز جج نے اس رائے میں مداخلت کی کہ سرکاری وکیل مسٹر بٹالوی کی بیان کردہ بیشتر وجوہات کو ہی لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے میں اپنایا گیا ہے۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو — "مائی لارڈ، انہوں نے نعم البدل کے مسئلے سے اختلاف کیا۔ انہوں نے اس فوجداری مقدمہ میں بلند آہنگ انداز میں محض مفروضات قیاسات کو ہی پیش کیا۔ انہوں نے اس مقدمے میں ثبوت لا آف ٹارٹس سے فراہم کیا۔ مائی لارڈ، میں اس قانون کو بھی بخوبی جانتا ہوں۔ مجھے ویلنگٹن اس زمانے سے یاد ہے جب میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ میں ہولڈرز کا مطالعہ کر چکا ہوں۔ میں ٹارٹس اور سٹیونسن کے قانون سے واقف ہوں۔ مائی لارڈ، ٹارٹس کے قانون کی درجہ بندیوں کو بند نہیں کیا گیا۔ ٹارٹس میں ثبوت کی مقدار کو کسی فوجداری مقدمے میں نصب نہیں کیا جا سکتا۔ سرکاری وکیل نے نعم البدل کے بارے میں ہائی کورٹ کے خیال کو نظر انداز اور یکسر موقوف کر دیا۔ کیا یہ نعم البدل احمد تھا؟ یا راؤ رشید یا پھر باجوہ؟ یہ تمام نظریات اختلافی اور نزاعی ہیں۔ ان میں تضادات پائے جاتے ہیں۔

مائی لارڈ، اس کے بعد سوال ڈبل ٹیسٹ کا پیدا ہوتا ہے۔ آخر کار اگر کوئی شخص تصدیق و توثیق کرنے والا ہے تو ایسا شخص سب سے پہلے اپنی صفات کے اعتبار سے ایک قابل اعتماد گواہ ہونا چاہیے۔ اور اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہونے کی سکت رکھتے ہوئے اسے ٹھوس شہادتوں کے ساتھ مطابقت رکھنی چاہیے۔ آزادانہ شہادت اور مناسب شہادت سرے سے ہی اس مقدمے میں سامنے نہیں آ رہی۔

اس کے بعد ہم سیکشن نمبر دس کے سوال پر آتے ہیں۔ کوئی شخص بھی سیکشن نمبر ۱۰ کو گندے ہاتھوں سے کیسے کھول سکتا ہے؟ وہ جو اس کام کے مساوی ہوگا اس کے ہاتھ بھی صاف ہوں گے۔ سیکشن نمبر ۱۰ صرف صاف ستھرے ہاتھوں سے ہی کھولا جا سکتا ہے جو آزاد گواہی دے سکتے ہوں اور پھر اس میں گندے ہاتھ آ سکتے ہیں۔ اسے گندے ہاتھوں سے کسی طرح بھی کھولا نہیں جا سکتا۔ گندے ہاتھ اس میں اسی وقت دخل اندازی کر سکتے ہیں جب اسے صاف ستھرے ہاتھوں سے کھولا گیا ہو۔ مائی لارڈ، اس کے بعد سازش کا مرحلہ آتا ہے۔ یہ ایک ہولناک چیز ہے کہ اسے ایک سازش ثابت کرنے کے لیے دُم سے سر تک جانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

اس مقدمے میں مائی لارڈ مثال قائم کرنے کے لیے بہت آسانی سے یہ بھی ثابت کیا جا سکتا ہے کہ حال ہی میں جو واقعات گیونا میں رونما ہوئے ہیں۔ ان کی تمام ذمہ داری صدر کارٹر پر عائد ہوتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ایسا کیا جا سکتا ہے کہ کانگریس کے رکن سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ پہنچے اور وہاں جا کر انہوں نے کہا کہ ان کا گیونا جانا بہت ضروری ہو گیا ہے کیونکہ انہوں نے سنا ہے کہ وہاں عجیب وغریب واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ اس لیے اسے وہاں جانے کی اجازت مل گئی اور وہ وہاں پہنچے تو وہاں قتل عام شروع ہو گیا اور وہاں مارے گئے۔ اور پھر ماضی کے واقعات کا سراغ لگاتے ہوئے اس کے قتل کا الزام ریاست ہائے متحدہ کے صدر کے سر لگایا جا سکتا ہے۔

سوال یہ نہیں ہے کہ گاڑی کو گھوڑوں کے آگے باندھا جائے۔ آپ گاڑی کو گھوڑوں کے آگے باندھیں یا گھوڑوں کو گاڑی کے آگے، مسئلہ یہ ہے کہ کسی طرح گاڑی حرکت میں آ جائے۔ اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ گھوڑوں کو گاڑی کے آگے باندھا جائے۔ اگر گاڑی کو گھوڑوں کے آگے باندھا جائے تو پھر گاڑی حرکت میں نہیں آ سکتی۔

کوئی اگلا قدم اٹھانے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ آپ کسی بات پر رضامند ہو جائیں۔ اگر کسی بات پر اتفاق ہی نہ ہو سکے تو پھر وقت کو تحریف اور جبر واکراہ پر کیوں ضائع کیا جائے تحریف اسی صورت میں کارآمد ہو سکتی ہے۔ جب پہلے سے کسی بات پر اتفاق ہو چکا ہو۔ اس حالت میں یہاں کسی بات پر اتفاق نہیں ہوا۔ کوئی سازش نہیں ہوئی۔ یا پہلے سے بنائی گئی کسی سازش کا وجود نہیں ملتا۔ کوئی ایسی سازش جس کا سراغ ملک حق نواز ٹوانہ کے زمانے سے ملتا ہو۔ اس سازش کے حوالے سے کسی مستند تاریخ کا کوئی ذکر اور حوالہ نہیں ملتا۔ اس کا زمانہ فرض کر لیا گیا ہے کہ اپریل یا جون یا پھر اگست کی تقریر کے زمانے میں ہوئی یا پھر اسلام آباد میں ہونے والے حادثے کے بعد، جس سازش پر اصرار کیا گیا ہے۔ یہ سازش کرنے کی کوئی ایک تاریخ نہیں بتائی جاتی۔ مفروضوں سے کام لیا جاتا ہے۔ جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے۔ مجھے تو ایف آئی آر میں بھی براہ راست شامل نہیں کیا گیا۔ میرا تو وہاں صرف ذکر اور اندراج ہوا ہے۔ (یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مسٹر بھٹو نے بھی ایک تقریر کی) اس سے مجھے ملزم ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

اس سے کہاں خاص اشارہ ملتا ہے کہ میں قصوری کے والد کا قاتل ہوں۔ جیسے کہ جسٹس وحید الدین نے اس کی نشاندہی کی تھی کہ یہ جواز کی ایک وجہ تو بن سکتی ہے۔ لیکن اسے ایک جواز قرار نہیں دیا جا سکتا۔

مائی لارڈ، میں بہرحال اپنے بارے میں گفتگو کرنا پسند نہیں کرتا۔ اس کی وجہ صرف یہ نہیں ہے کہ میں پریشان اور ہراساں ہوں۔ بلکہ اس لیے کہ عوام ہراساں ہوں گے۔ اس سے انہیں تکلیف پہنچے گی آپ یقین کیجیے، اس سے بحران پیدا ہو سکتا ہے۔ باور کیجیے، میرے ساتھ بہت بُرا۔ بہت ہی بُرا رویہ اختیار کیا گیا۔

مائی لارڈ، میں معذرت کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں ایک بے جرم مظہر نہیں ہوں میں نے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ صدر سادات اب بھی اسرائیل سے اپنا علاقہ واپس لینے کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔ بیگن کا دعوےٰ ہے کہ یہ زمین اسرائیل کی ہے۔ اسی طرح ہندوا سے بھارت ماتا کہتے تھے لیکن میں نوے ہزار جنگی قیدیوں کو واپس لایا۔ اس کے باوجود میرے ساتھ مجرموں کا سا سلوک کیا گیا۔ میں مجرم نہیں ہوں۔ میں قطعی طور پر مجرم نہیں ہوں۔ لیکن میرے ساتھ دوسرے ملزموں سے بھی بدتر سلوک کیا گیا۔ میں موسیقی کی آواز سنتا ہوں۔ میں موت کی کوٹھڑی میں ان کے قہقہے سنتا ہوں۔ جہاں سے میں باہر نہیں نکل سکتا۔ مائی لارڈ نوے دنوں میں میں نے دھوپ دیکھی ہے نہ روشنی اکتوبر کی ۱۵ تاریخ کو جب دو قیدی بھاگ گئے مجھے سربمہر کر دیا گیا۔ آپ ہی بتائیے کہ ان قیدیوں کے فرار کے ساتھ میرا کیا تعلق ہو سکتا تھا۔ میں تو اپنے ملک سے نہیں بھاگا۔ نہ ہی میں اپنے ملک سے بھاگوں گا۔

مائی لارڈ مسٹر مصطفےٰ کھر نے مجھے مری میں مشورہ دیا کہ میں ملک چھوڑ کر بھاگ جاؤں اس نے کہا تھا کہ یہ لوگ میرے خون کے پیاسے ہیں۔ میں نے اسے جواب دیا نہیں تم جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔ میں اپنا ملک نہیں چھوڑوں گا۔ میں اپنی جڑوں سے اپنا تعلق ختم نہیں کروں گا۔ ۱۳ ستمبر کو صادق حسین قریشی کے گھر میں پریس کانفرنس کے بعد ایک غیر ملکی صحافی نے جس کا نام میں بتا نہیں سکتا مجھے ایک طرف لے جا کر کہا کہ مسٹر بھٹو میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ آپ کے لیے کیا کچھ ہو رہا ہے۔ آپ کی بہتری اسی میں ہے کہ یہ ملک چھوڑ جائیں میں چونکہ آپ کا ایک مداح

ہوں اس لیے آپ کو یہ مشورہ دے رہا ہوں۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اسے بتایا کہ میں اپنا ملک نہیں چھوڑ سکتا اور اس سے مزید کوئی بات سننا نہیں چاہتا۔ تاہم اس شخص میں کبھی بھول بھی نہیں سکتا۔ اس کے بعد اس نے کہا پلیز آپ لاڑکانہ نہ جائیں کسی اور جگہ چلے جائیں۔ آپ کو قطعاً اندازہ نہیں کہ آپ کے خلاف کیا ہو رہا ہے۔ میں نے اسے کہا میں لاڑکانہ جاؤں گا وہ زمین جہاں میں پیدا ہوا جس سے میرا تعلق ہے اور جہاں میں چاہتا ہوں کہ ایک دن ہمیشہ کے لیے واپس چلا جاؤں۔ میں اس زمین سے باہر نہیں جاؤں گا۔

مائی لارڈ میں قطعاً یہ نہیں چاہتا کہ مجھ پر رحم کیا جائے۔ میں کسی کے رحم کا طلب گار نہیں اور میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ مجھے معافی نہیں چاہیئے۔ مجھے انصاف چاہیئے۔ میں اپنی زندگی کے لیے نہیں لڑ رہا زندگی جو گوشت پوست سے عبارت ہوتی ہے۔ کیونکہ ایک نہ ایک دن تو ہر ایک کو جانا ہی ہے۔ میری زندگی پر کئی حملے ہو چکے ہیں۔ مائی لارڈ مجھ پر سانگھڑ میں قاتلانہ حملہ ہوا معجزانہ طور پر میں بچ گیا۔ پھر صادق آباد میں حملہ ہوا اس کے بعد صوبہ سرحد کے قبائلی علاقہ میں ایک بم پھٹا میری تقریر سے چند لمحے پہلے لیکن میں نے ایک لمحہ کا انتظار نہیں کیا اٹھا اور تقریر شروع کر دی۔ بلوچستان میں چار یا پانچ بار میری جان لینے کی کوشش کی گئی ان میں سے ایک حملہ ایک لنگاہ نے مجھ پر کیا جس نے میری طرف ایک ہینڈ گرنیڈ پھینکتے ہوئے کہا تھا یہ لو پنجابیوں کے چمچے۔ خان آف قلات نے جو میرے انتہائی قریبی دوست تھے۔ مجھے مشورہ دیا کہ میں باہر نہ جاؤں ورنہ مجھے قتل کر دیا جائے گا۔ میں نے جواب دیا تھا مجھے اپنے سرکاری فرائض انجام دینے ہیں اور مجھے ایک عوامی جلسہ سے لازماً خطاب کرنا ہے۔ یہ ہے میری زندگی جس کے لیے میں کوشاں ہوں کہ مجھے انصاف دیا جائے۔

مائی لارڈ انصاف کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا اور یہ ایک جعلی مقدمہ ہے۔ میرے خلاف یہ ایک مکمل سازش تیار کی گئی ہے۔ یہاں مسئلہ یہ نہیں ہے کہ میں اپنی معصومیت کو ثابت کروں مسئلہ یہ ہے کہ استغاثہ کو اپنا کیس معقولیت اور کسی شبہ سے ماورا ہو کر ثابت کرنا چاہیئے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ میری بے گناہی محض اس لیے ثابت نہ ہو کہ میں ایک فرد ذوالفقار علی بھٹو بلکہ میری خواہش یہ ہے کہ اسے انتہائی بلند معیار پر حقائق کے پیش نظر ثابت کیا جائے کیونکہ میرے ساتھ

ہولناک بے انصافی کی جا رہی ہے۔ اس مقدمے میں ہر رنگ سے میری سیاسی کردار کشی کرنے کے لیے جو انداز اختیار کئے گئے ہیں اس کی مثال نہیں ملتی ہر چیز کو سائے اور دھند میں لپیٹ دیا گیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس حوالے سے میں اس بُرے سلوک کا ذکر کروں جس سے مجھے دو چار ہونا پڑا۔ کیونکہ ایک بیمار اور بری حکومت ہی کسی شخص کے ساتھ ایسا غیر منصفانہ رویہ اختیار کرتی ہے وہ مسلسل یہ کہتے رہے کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ میرے ساتھ ایک وزیر اعظم جیسا سلوک کیا جائے کیونکہ میں اب بھی اپنے آپ کو صدر سمجھتا ہوں۔ مائی لارڈ میں ایک عاجز انسان ہوں یہ میری خواہش نہیں ہے کہ میرے ساتھ صدر یا وزیر اعظم جیسا سلوک روا رکھا جائے۔ اگر میں اس نکتہ پر اصرار کر رہا ہوں تو اس لیے کہ یہ وہ حقیقت ہے کہ میرے خلاف ایک مقدمہ کا تانا بانا بنا گیا جو جعلی اور جھوٹا تھا۔ میں تو یہ بھول جانا چاہتا ہوں کہ میں صدر یا وزیر اعظم تھا۔ لیکن میرے ساتھ ناروا سلوک کرنے کے لیے اس مقدمے میں موجودہ حکومت نے بار بار اس نکتہ پر اصرار کیا جبکہ میرا اصرار صرف اتنا تھا کہ مجھ سے ایک انسان جیسا سلوک کیا جائے جس کا میں استحقاق رکھتا ہوں۔

مائی لارڈ انتہائی تکلیف دہ اشتعال انگیزیوں کے باوجود میں نے ہمیشہ عدالت کے وقار کا خیال رکھا۔ میں نے ہمیشہ عدالت کے احترام کا شدید اظہار کیا جبکہ مجھے نام کا مسلمان کہہ کر پکارا گیا۔ مجھے عادی جھوٹا کہا گیا۔ جب بھی میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی مجھے ڈانٹ دیا گیا اور بار بار مجھے عادی جھوٹا کہا گیا۔ راتوں رات میرے لیے ایک کٹہرا بنایا تاکہ مجھے اس کے پیچھے کھڑا کیا جائے۔ جب میں نے اس پر احتجاج کیا تو کہا گیا کہ میں ایک آرام دہ کرسی کا طلب گار ہوں کیونکہ میں آرام دہ زندگی گزارنے کا عادی ہوں کہ مجھے ایک ایسی کرسی دی گئی جسے کئی دوسرے وکلاء پہلے استعمال کر چکے تھے۔ مائی لارڈ یقیناً میں نے ایک آرام دہ زندگی بسر کی ہے لیکن اپنی زندگی کو آرام دہ بسر کرنے کے لیے میں نے کسی کی جائداد نہیں ہتھیائی۔ میرا گھرانہ کئی نسلوں سے خوش حال چلا آ رہا ہے لیکن لاہور ہائی کورٹ کی تاریخ میں پہلی بار یا شاید پھر اس سے پہلے ایک دفعہ مسٹر جسٹس اکرام کو یاد ہو گا کہ برطانوی دور میں جسٹس ینگ کے زمانے میں عدالت کے اندر ایک کٹہرا بنا دیا گیا تھا۔ مائی لارڈ کالا باغ کے بیٹے پر لاہور ہائی کورٹ میں قتل کا مقدمہ چلا تھا۔ لیکن اسے کسی کٹہرے

کے پیچھے نہیں کھڑا کیا گیا تھا۔

۲۴ نومبر کو ایک عجیب مماثلت پیش کرتے ہوئے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے کہا کہ جرمن جرنیلوں پر بھی تو نیورمبرگ میں مقدمہ چلایا گیا تھا۔ یہ بھلا کیا موازنہ ہوا۔ ہٹلر ایک ظالم تھا۔ وہ ایک لعنت تھا وہ ایک درندہ تھا اس نے ایک تہذیب کو تباہ کر دیا۔ اس نے یورپ کی روشنیاں گل کر دیں۔ غیر ملکی فاتح فوجیں آئیں اور انہوں نے اس لیے جرمن جرنیلوں پر مقدمے چلائے کہ انہوں نے چالیس ملین انسانوں کی ہلاکت میں حصّہ لیا تھا اس کے باوجود ان مقدموں پر تنقید کی گئی۔ مائی لارڈ گورنگ کے خلاف جیکسن نے جو استغاثہ پیش کیا اسے تقریباً تہہ و بالا کر دیا گیا تھا۔ جبکہ دنیا جانتی ہے گورنگ چنگیز خان سے بھی بدتر انسان تھا اس پر چالیس ملین انسانوں کی ہلاکت کا الزام تھا۔ مائی لارڈ یہ جو مثال جرمن جرنیلوں کے حوالے سے فاتح فوج کی دی گئی ہے اس میں یہ ذکر بھی ناگزیر ہے کہ جرمن جرنیلوں سے مجھ سے بہتر سلوک کیا گیا تھا۔ انہیں عدالت میں عمدہ نشستوں پر وقار سے بٹھایا گیا تھا۔ ان کے لیے کٹہرے تعمیر نہیں کیے گئے تھے۔

مائی لارڈ جب میں شدید علیل ہوا تو مجھے کہا گیا کہ علاج کے لیے میں عدالت سے اجازت لوں اور جب میں نے اپنی بیٹی سے ملاقات کے لیے کہا جسے بے انتہا چاہتا ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ اگر میرے بیٹے مجھے مایوس کریں گے تو بھی میری بیٹی مجھے کبھی مایوس نہیں کرے گی۔ ملاقات کے لیے اس درخواست کے ضمن میں کہا گیا کہ یہ عدالت کے دائرہ اختیار سے باہر ہے کیونکہ مجھے مارشل لا ریگولیشن نمبر ۱۲ کے تحت حراست میں لیا گیا ہے اس لیے عدالت کا مجھ پر کوئی اختیار نہیں جبکہ اس کے ساتھ ساتھ عدالت نے ایک سینئر افسر کو روزانہ میرے ساتھ متعین کیا ہوا تھا کہ وہ ہر روز میرے ساتھ جیل سے عدالت تک جائے۔ عدالت جہاں چاہتی اپنے اختیار کا مظاہرہ کرتی اور جہاں اس کی مرضی نہیں ہوتی تھی یہ دلیل دے دی جاتی کہ یہ عدالت کے دائرہ کار سے باہر ہے۔

اور پھر مائی لارڈ، میں یہ بات کہوں گا کہ میں نے جو کچھ کیا وہ پورا ریکارڈ میں پیش نہیں کیا گیا اسی وجہ سے میں سمجھتا ہوں کہ یور لارڈشپس ساری صورت حال کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ انہوں نے

مجھے مکمل طور پر اس مسئلے میں جکڑے اور مرکوز رکھا کہ کیا اس مقدمے کی سماعت بند کمرے میں ہو سکتی ہے یا نہیں؟ جب کبھی میں نے اس خاص نکتے سے باہر تجاوز کیا تو میرے الفاظ کو قلم بند نہیں کیا گیا اور مجھے بتایا گیا کہ یہ فیصلہ کرنا عدالت کا کام ہے کہ کس چیز کو قلم بند کرنا ہے اور کسے نہیں؟ اور سٹینوگرافر کے لیے ضروری نہیں کہ میں جو کچھ کہوں وہ اسے قلم بند بھی کرے

اس کے علاوہ مائی لارڈ، عدالت میں بہت سی گمراہ کن اور اشتعال انگیز آرا بھی صادر کی گئیں۔ ایسی آرا جو اس ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کر سکتی ہیں۔ جو اس عدالت کے متعصبانہ رویّے کا اظہار اس مقدمے میں کرتی تھیں۔ میں صوبائی تعصب کے اس تماشے کو دیکھ کر چکرا گیا میں ششدر رہ گیا اور میں نے اپنے آپ سے کہا "میرے خدا" اگر یہ باتیں باہر پہنچ گئیں اور ان کا اعادہ کیا گیا تو نتیجہ بہت خوفناک ہو گا۔ اس لیے میں نے اپنا منہ بند رکھا۔

مائی لارڈ، پریذائڈنگ جج کے تعصب کی ایک ٹھوس مثال پیش کرنے کے لیے ایک واقعہ بیان کروں گا۔ جس کے بارے میں قیاس اغلب ہے کہ آپ نے اس سے پہلے یہاں نہیں سنا۔ ۲۰ ستمبر کو مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ راولپنڈی میں چیف الیکشن کمشنر کے سامنے ازالۂ عرفی کے مقدمے میں پیش ہوئے۔ عبدالحفیظ پیرزادہ کی سماعت کے بعد چیف الیکشن کمشنر نے انہیں اپنے چیمبر میں آنے کی دعوت دی جہاں کمیشن کے تین چار ارکان بھی موجود تھے۔ وہاں چیف الیکشن کمشنر نے جو میرے مقدمے کی سماعت کرنے والی عدالت کے بھی صدر جج تھے، میرے خلاف باتیں کیں اور کہا میں نے سیاست دانوں کے خلاف تیس جلدیں مرتب کی ہیں اور مسٹر پیرزادہ کو پڑھنا چاہیے کہ میں نے ان کے بارے میں کیا کہا ہے۔ انھوں نے مسٹر پیرزادہ کو مشورہ دیا کہ وہ مجھے چھوڑ دیں۔ مسٹر پیرزادہ کو شدید صدمہ پہنچا اور ان کے کہنے کے مطابق وہ اشتعال میں آگئے۔

(یہاں ڈاکٹر نعیم حسن شاہ نے مداخلت کرتے ہوئے بتایا کہ مسٹر بھٹو کو صحیح اطلاع نہیں دی گئی۔ کیونکہ وہ اس وقت خود چیف الیکشن کمشنر کے پاس موجود تھے۔ وہاں چیف الیکشن کمشنر نے ان کے خلاف کچھ نہیں کہا)

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو۔ یور لارڈشپس نے جو کچھ فرمایا ہے میں ابھی وقت اسے قبول کرتا

ہوں ۔ میں محض وہ بات دہرا رہا تھا ۔ جو مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ نے خود مجھے اس وقت بتائی تھیں جب میں کوٹ لکھپت جیل لاہور میں تھا ۔ بہر حال اگر میں وہ چھوڑ بھی دوں جو مجھے مسٹر پیرزادہ نے مجھے بتایا تھا ۔ تو بھی مختلف اوقات میں جس مطلق اور مفروضی تعصب اور یک طرفہ جھکاؤ کا مظاہرہ ہوا انہیں کیسے چھوڑا جا سکتا ہے ۔ یہ تو ایک پہلو ہوا ۔ مسٹر پیرزادہ نے مجھے جو کچھ بتایا میں اسے ترک کرتا ہوں ۔ کیونکہ میں مضبوط زمین پر کھڑا ہوں ۔ میں ریکارڈ پر انحصار کرتا ہوں ۔ میں اس آرڈر کا حوالہ دیتا ہوں جسے جاری کیا گیا ۔

اب ، مائی لارڈ آپ کے ہاتھوں میں ہوں ۔ یور لارڈ شپس نے انتہائی عنایت و کرم کا مظاہرہ کر کے مجھے یہ موقع فراہم کیا ۔ میں اسے بے حد سراہتا ہوں ۔ مجھے اس عدالت پر اعتماد ہے اور میں نے اس موقع کو اچھی نیت کے ساتھ قبول کیا ہے ۔ میں آپ کے فیصلے پر بھرپور اعتماد کرتا ہوں ۔ میں نے وسیع سطح پر ان نکات کا ذکر کر دیا ہے ۔ جنہیں میں تفصیل سے پیش کرنا چاہتا ہوں ۔ آج میں قطعی طور پر بغیر تیاری کے حاضر ہوا تھا ۔ اگرچہ میرے وکلا نے میرے ساتھ ملاقات کی تھی ۔ وہ مجھے ایک چھوٹے ، حبس زدہ ، دم گھونٹ دینے والے ۷ × ۱۰ جسامت والے کمرے میں ملے ۔ جہاں بمشکل ہی کوئی بات ہو سکتی ہے ۔ جہاں مجھ پر ان کو افسوس ہوا اور میں نے انہیں ان کا وقت ختم ہونے سے پہلے ہی جانے دیا ۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو غیر آرام دہ محسوس کرنے لگے تھے ۔

اب ، اگر یور لارڈ شپس مجھے از راہ مہربانی بتا دیں کہ وہ کتنی دیر تک میری شنوائی کر سکتے ہیں تو میں ترجیحات کا یقین کر لوں ۔ اور اپنے دلائل اور نکات کو مختصر کر سکوں ۔ میں اپنی دوسری وجوہات سے قطع نظر بعض چیزوں کو ان کے صحیح تناظر میں پیش کرنے کے لیے بھی کچھ کہنا چاہوں گا ۔ کہ اس وقت ہمارے ملک کے حالات کیا ہیں ؟ اس خطے میں کیا حالات ہیں ۔ اور دنیا میں کیا ہو رہا ہے ۔ کیونکہ ، یقین کیجیے ، پاکستان اس وقت بہت نازک اور خطرناک دور سے گزر رہا ہے مائی لارڈ ، اس کا تعلق حکومتوں یا خاص افراد کے ساتھ بالکل نہیں ہوگا ۔ شاید آپ کہیں گے کہ میں بڑا خود پسند اور بڑ ہانکنے والا شخص ہوں ۔ لیکن یقیناً آپ یہ محسوس کریں گے کہ ہمارے ملک میں کتنا رسوا کن خلا پیدا ہو گیا ہے ۔ یہ ایک بنجر اور بے ثمر خلا ہے ۔ ایک برس پہلے جب میں کوٹ لکھپت

جیل میں تھا۔ میں نے یہ کہا تھا کہ ایک برس کے اندر بھارت کا وزیر خارجہ پاکستان کے بارے میں ایک سخت بیان دے گا۔ میں نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ صدر سادات یروشلم جائیں گے۔ اور میں نے نتائج کی بھی پیشین گوئی کر دی تھی۔ آج بطور خاص طاقت کا توازن بری طرح منتقل ہو چکا ہے اور اس تیزی سے منتقل ہو رہا ہے کہ برصغیر ایک نئی سیاسی صورت حال کا سامنا کر رہا ہے۔

اس مرحلے پر چیف جسٹس نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ مسٹر بھٹو اس وقت تک بول سکتے ہیں جب تک وہ یہ محسوس کریں کہ وہ اس مقدمے کے متعلقہ امور کے بارے میں کچھ کہہ سکتے ہیں اور عدالت یقینی اور فطری طور پر ان کی سماعت کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ جہاں تک دوسرے امور کا تعلق ہے۔ اگرچہ وہ ملک کے لیے بے حد مفید ثابت ہو سکتے ہیں اور اس معزز ججوں کے لیے بھی پاکستانی شہری ہونے کے حوالے سے مفید ہوں گے۔ خاص طور پر اس لیے کہ ان امور کے بارے میں مسٹر بھٹو اظہار خیال کریں گے جو کہ امور خارجہ میں گہری بصیرت رکھتے ہیں۔ لیکن عدالت کو مقدمات کے دائرے میں رہنا ہوتا ہے۔ اس لیے ایسے معاملات عموماً متعلقہ نہیں ہوتے۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو۔ مائی لارڈ "آپ نے جو فرمایا ہے۔ میں اسے فوراً تسلیم کرتا ہوں۔"

مسٹر جسٹس حسن شاہ نے مسٹر بھٹو سے پوچھا کہ وہ اپنا بیان کل بھی جاری رکھنا پسند کریں گے۔ مسٹر یحییٰ بختیار نے واضح کیا کہ مسٹر بھٹو تھک چکے ہیں۔ اس لیے اسے پرسوں جاری رکھنا زیادہ مناسب ہوگا۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو۔ یہ پہلا موقع ہے کہ میں قید تنہائی سے باہر نکلا ہوں۔ میرے لیے یہ بہت مشکل ہو رہا ہے کہ میں اس توازن اور برابری کو ایڈجسٹ کر سکوں۔ میں بمشکل کھڑا ہو سکتا ہوں۔

معزز چیف جسٹس نے مسٹر بھٹو سے پوچھا کہ کیا وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ اپنا بیان جاری رکھ سکیں گے۔ مسٹر بھٹو نے جواب دیا اگر عدالت کی یہ خواہش ہو تو وہ جاری

رکھ سکیں۔

ایک معزز جج نے رائے دیتے ہوئے کہا کہ یہ ضروری نہیں ہے۔

یوں سماعت اگلے دن صبح نو بجے تک کے لیے ملتوی کر دی گئی۔ مسٹر یحییٰ بختیار نے استدعا کی کہ عدالت کا وقت نو سے ساڑھے نو بجے کر دیا جائے لیکن چیف جسٹس نے کہا کہ نو بجے کا وقت ہی مناسب ہے۔ کیونکہ مسٹر بھٹو صبح جلدی بیدار ہونے کے عادی ہیں۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو۔ سحر خیز؟ مائی لارڈ مجھے تو سونے کی اجازت ہی نہیں دی جاتی کوٹ لکھپت جیل میں پچاس پاگل میری کوٹھڑی کے قریب لا کر تین ماہ تک رکھے گئے وہ سارا وقت چیختے اور چلاتے رہتے تھے اور میرے لیے سونا مشکل ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد مجھے راولپنڈی لایا گیا تو یہاں شروع میں یہ کھیل شروع کیا گیا کہ میری کوٹھڑی کی چھت پر کنکر پتھر پھینکے جاتے تھے پہلے پہل میں نے سوچا کہ میں شاید خواب دیکھ رہا ہوں۔ لیکن رمضان کے دنوں میں میں سحری کے انتظار میں رات جاگتا رہتا۔ تب میں نے ٹین کی چھت پر شور سنا جو ہر پندرہ منٹوں کے وقفے کے بعد کیا جاتا تھا۔ تب مجھے حقیقت کا احساس ہوا۔ چھت پر کنکر اور پتھر پھینکے جاتے ہیں جب یہ سلسلہ ختم ہوا تو ایک نیا حربہ اختیار کیا گیا۔ میری کوٹھڑی کے بالکل قریب ایک مورچہ ہے جہاں ایک فوجی گارڈ متعین ہے۔ اب وہاں وقفوں کے بعد اپنے جوتوں کے ساتھ گارڈ چھلانگ لگاتا۔ یوں کنکر پتھروں ان چھلانگوں کے خوفناک شور نے جگہ لے لی۔ یہ شور دہرا ہوتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ایک گارڈ کے بجائے کئی گارڈ متعین ہیں۔ پچھلی رات میں نے سوچا اس مسلسل اذیت سے نجات مل جائے گی کیونکہ میں نے صبح عدالت جانا ہے لیکن یہ شور بدستور ہوتا رہا

یور لارڈ شپس، میری روح، میرا عزم اور میری قوت ارادی ہے اور یہ کہ میں ایک رہنما ہوں ان وجوہات کی بنا پر میں اذیت بھری ابتلا کا سامنا کرنے کے قابل ہوں۔ اور یہاں بھی حاضر ہو گیا ہوں۔ ایک عام آدمی کب کا تباہ و برباد اور بکھر چکا ہوتا۔ آپ نہیں جانتے کہ میں کتنا پریشان اور بدحال ہو چکا ہوں۔ میں ختم ہو چکا ہوں۔

مجھے پچیس دنوں سے موت کی اس کوٹھڑی میں پانی تک نہیں — کل ہی میری طبیعت کچھ سنبھلی ہے۔ لیکن اگر یور لارڈشپ کی یہی مرضی ہے تو میں کل نو بجے حتیٰ کہ آٹھ بجے بھی آسکتا ہوں۔

چیف جسٹس نے ایڈووکیٹ آن ریکارڈ برائے استغاثہ کو ہدایت دی کہ وہ یہ دیکھیں کہ مسٹر بھٹو بر وقت تیار ہو سکیں۔

دوسرا دن

ایک برائے نام مسلمان

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو۔ یور لارڈ شپس آپ کو یاد ہوگا کہ گذشتہ روز میں نے کہا تھا کہ میں بات کا آغاز 'نام کے مسلمان' کے مسئلے سے کروں گا اور ان پیراگراف کا حوالہ دوں گا جو اس موضوع پر ٹرائل کورٹ نے اپنے فیصلے میں شامل کئے ہیں جو پیراگراف نمبر ۶۰۹ سے ۶۱۵ تک محیط ہیں۔ مائی لارڈ

ایک اسلامی ملک میں ایک کلمہ گو کے عجز کے لیے یہ ایک غیر معمولی واقعہ ہوگا کہ وہ یہ ثابت کرے کہ وہ مسلمان ہے۔ میرے خیال میں یہ اسلامی تمدن کی تاریخ کا پہلا واقعہ ہے کہ ایک مسلم صدر، ایک مسلم رہنما، ایک مسلم وزیر اعظم جسے مسلمان قوم نے منتخب کیا ہو، ایک دن اپنے آپ کو اس حیثیت میں پائے کہ وہ یہ کہے کہ وہ ایک مسلمان ہے۔

یہ ایک ہراساں کر دینے والا مسئلہ ہی نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک کربناک معاملہ بھی ہے۔ یور لارڈ شپس یہ مسئلہ کیسا کھڑا ہوا! آخر کس طرح؟ یہ مسئلہ اصطلاحاً عوام کے انقلاب یا کسی تحریک کے نتیجے میں نہیں کھڑا کیا گیا جو اس کے خلاف چلائی گئی ہو کہ وہ شخص مسلمان نہیں ہے۔ یہ ایک آئیوری ٹاور سے آیا ہے۔ اسے بطور ایک رائے کے ایک فرد نے دیا ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ وہ خواہ کتنے ہی اعلیٰ عہدے پر کیوں نہ ہو۔ لیکن دراصل اسے اس معاملے میں دخل دینے کا کوئی استحقاق نہیں ہے۔ جو امور اس کی سماعت کے دائرے میں آتے ہیں۔ ان میں یہ معاملہ قطعی طور پر شامل نہیں۔ نہ ہی یہ اس کا موضوع ہے کہ جس پر وہ اپنا موقف بیان کر سکے

کسی فرد، کسی ادارے اور اس عدالتی بنچ کا یہ حق نہیں بنتا کہ وہ ایک ایسے معاملے پر اپنی رائے دے۔ جس پر رائے دینے کا اسے کوئی جائز حق حاصل نہیں۔

یور لارڈ شپس میں یہاں ہارون الرشید کی مثال پیش کروں گا۔ ہارون الرشید کے دربار میں مسلمانوں کے ایک بہت بڑے عالم نے دربار میں اُٹھ کر ہارون الرشید سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ فرض کیجیے کہ اگر میں آپ کو یہ بتاؤں کہ آج سے میں خدا پر ایمان نہیں رکھتا اور اسلام میں بھی یقین چھوڑ دیا ہے تو...... ہارون الرشید نے جواب دیا تھا "میں آپ کی بات پر یقین نہیں کروں گا۔" کیونکہ اس پر یقین کرنا میرا کام نہیں ہے۔ یہ تمہارا اور خدا کا معاملہ ہے۔ وہی یہ طے ہو گا کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ صحیح ہے یا نہیں۔ لیکن جہاں تک میرا معاملہ ہے میرا عقیدہ ہے کہ آپ ایک مسلمان ہیں کیونکہ آپ ایک مسلمان تھے۔ لیکن اب چونکہ آپ نے یہ خود مجھے بتایا ہے تو میں اسے اپنے سماج کی بُردباری کے تحت اسے قبول کرتا ہوں۔ یہ تھے الفاظ جو ہارون الرشید کے دربار میں کہے گئے تھے۔ خدائے واحد کا عقیدہ رکھنے والے موحد ہیں، انتہائی محتاط طریقے سے کہوں گا کہ وہ اپنے عقیدے کے اظہار کے لیے مختلف ذرائع اور طریقے اختیار کرتے ہیں۔ (میرے نقطۂ نظر کے مطابق تقریباً تمام مذاہب واحدانیت کے قائل ہیں۔ تقریباً سب مذاہب خدا پر ایمان لاتے ہیں۔) سائنٹیفک انداز میں کہا جا سکتا ہے کہ خدا کی واحدانیت کا تصور یہودیت سے شروع ہوا یعنی حضرت ابراہیمؑ سے اور ان کے بعد ان کے جانشینوں اور اسرائیلی یہودی پیغمبروں سے، جو آپ کے بعد آئے۔ مذہبی یہودی تہذیب کے عروج پر پہنچنے کے بعد "منتخب قبیلہ" کا تصور ظہور پذیر ہوا۔

اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ اور ان کے بعد عیسائیت آئی۔ حضرت عیسیٰؑ خود کہتے ہیں کہ میں آدمی کا بیٹا ہوں۔ اسلام خود ان کی بے داغ پاکیزگی کے تصور میں ایمان رکھتا ہے۔ اسلام حضرت عیسیٰؑ کے منزہ اور پاک ہونے کو تسلیم کرتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے صرف یہی نہیں کہا تھا کہ میں ایک آدمی کا بیٹا ہوں۔ بلکہ یہ بھی کہا تھا کہ میں ایک یہودی کا بیٹا ہوں۔ کیا آپ نے ایک نئے مذہب کا پرچار نہیں کیا۔؟ کیا آپ نے ایک نئے مذہب کی تبلیغ یا پھر یہ یہودیت کی ہی توسیع تھی۔ عیسائیت نے تثلیث کا تصور قائم کیا۔ باپ، بیٹا اور روح القدس، ایک طرح سے یہ واحدانیت

کے تصوّر سے بالکل مختلف ہے۔ یعنی ایک، خدائے واحد، جہانوں کے ایک مالک کے تصوّر کے منافی۔

اور اس کے بعد وہ مذہب آتا ہے۔ جس نے واحدانیت کی تکمیل کر دی۔ یعنی اسلام۔ اسلام کی دیگر فضیلتوں اور عظیم اضافوں کے علاوہ (کہ میں اس موضوع کا عالم نہیں ہوں) اسلام نے واحدانیت کے تصوّر اور عقیدے کو نئی زندگی دی۔ یعنی خدا واحد ہے۔ ایک۔ تثلیث کا تصوّر اسلام میں قبول نہیں کیا جاتا۔ اسلام نے خدا کی واحدانیت اور توحید کے عقیدے کو مستحکم کیا اس کے علاوہ یہ تصور اور عقیدہ دیا کہ انسان اور خدا کا رشتہ براہ راست ہے۔ اس میں کوئی واسطہ نہیں ہے۔ جس طرح یہودیوں کے مذہب میں ربّی کو واسطہ بنایا جاتا ہے یا پوپ اور پادریوں کو عیسائیت میں واسطے کی حیثیت دی جاتی ہے۔ پیغمبر اسلام نے خود یہ فرمایا کہ میں صرف خدا کا ایک پیامبر ہوں۔ وہ مذہب اسلام میں کسی اپنے اضافے کی نسبت کی نفی کرتے ہیں۔ بلاشبہ آپؐ ایک عظیم ترین سیاسی جینئس تھے۔ آپؐ ایک عظیم مجاہد تھے۔ آپ ایک عظیم فلسفی تھے۔ لیکن آپ نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ خود آپؐ نے اسلام میں اپنی طرف سے کوئی اضافہ کیا ہو۔ آپؐ نے کبھی یہ دعوےٰ نہیں کیا کہ یہ آیت میری ہے۔ آپؐ نے ہمیشہ فرمایا کہ یہ سب کچھ خدا کی دین ہے اور خدا اور آدمی کے درمیان کوئی بیچ کا واسطہ نہیں ہے۔

چونکہ انسان اور خدا کے درمیان کوئی بیچ کا واسطہ نہیں ہے۔ اس لیے یہاں معاشرے میں غلطیاں ہوتی ہیں۔ سماج میں سماجی برائیاں جنم لیتی ہیں۔ جو انسان اور انسان کے مابین تخلیق پاتی ہیں۔ اور ان کی سزا اسی دنیا میں ہی دی جاتی ہے۔ جیسے چوری، غنڈہ گردی، زنا وغیرہ۔ لیکن خدا کے خلاف بھی انسان جرم کرتے رہیں۔ جن کا اسلام میں ذکر موجود ہیں۔ لیکن ان گناہوں کا تصفیہ اللہ اور انسان کا معاملہ ہے اور اس کا فیصلہ خدا خود روزِ حشر کرے گا۔ اس حد تک انسان اور خدا کے درمیان براہ راست تعلق کی حد ہے۔ اسلام جو تبلیغ کرتا ہے۔ وہ یہودیوں کے خدا کی ہے نہ عیسائیوں کے خدا کی، یا مسلمانوں کے خدا کی بلکہ اسلام کے خدا کی ..... اس خدا کی جو اسلام کا خدا ہے۔ اسلام خدا کا جو تصور پیش کرتا ہے۔ وہ رب العالمین کا تصور ہے۔ وہ سارے جہانوں کا خدا ہے۔ وہ صرف مسلمانوں کا ہی خدا نہیں ہے۔ خدا جو قادرِ مطلق ہے۔ جو

مطلق العنان ہے۔ لیکن اس مطلق العنان اور جہانوں کے مالک خدا نے اپنے آپ پر ایک رضاکارانہ حد لگا رکھی ہے۔ ایک ایسی پابندی جو اس نے خود اپنے آپ پر لگائی ہے۔ اس نے اپنی مطلق العنانیت کو مشروط کر دیا ہے اور وہ کہتا ہے کہ رحم کرنا، معاف کرنا اس کا کرم ہے۔ وہ رحم و کرم کرتا ہے۔

اس دنیا کا خالق، کائنات کا خالق، اس جہاں کا خالق، دونوں جہانوں اور سات آسمانوں کا خالق، جس کے لیے ایسی کوئی پابندی نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ پر کوئی پابندی لگائے۔ وہ خود اپنی مطلق العنانیت اور قدرت پر پابندی لگاتا ہے اور کہتا ہے اس نے خود اپنے اوپر یہ پابندی لگائی کہ وہ رحم کرے؛ معاف کرے، مہربانی کرے اور اپنے مطلق العنان اختیارات کو رحم و کرم اور عفو و درگزر کا پابند کر دے۔

آنریبل چیف جسٹس:۔ مسٹر بھٹو! میں مداخلت کرنا سخت ناپسند کرتا ہوں۔ لیکن آپ اصل نکتے پر بات کیجیے کہ کیا ہائی کورٹ آپ کے بارے میں ایسا کوئی ریمارک دینے میں جواز رکھتی تھی یا نہیں؟

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو:۔ مائی لارڈ، یہ میرا وہ نکتہ ہے۔ جس کے بارے میں مجھے کوئی کچھ نہیں بتا سکتا۔

آنریبل چیف جسٹس:۔ بالکل درست۔ بہرحال یہی وہ نکتہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم اسے اسی طرح چھوڑ دیتے ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اس میں ہمیشہ کی دلچسپی موجود ہے۔ لیکن بدقسمتی ہم پر وقت کا شدید دباؤ ہے۔ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ان پیراگراف پر کیا تنقید کرتے ہیں۔ جو فیصلے میں موجود ہے۔ تو کیا آپ اس سلسلے میں کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو:۔ مائی لارڈ میں متعلقہ پیراگراف کے متن کے حوالے سے ان پر کسی حد تک تنقید کرنا چاہتا ہوں۔

ایک معزز جج:۔ تو پھر آپ کو اسے اس طرح بیان کرنا چاہیے کہ ہم کم از کم اس کے بارے میں جان سکیں۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو:۔ مجھ پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ میں ایسی باتوں سے ناواقف ہوں۔

آنریبل چیف جسٹس :- نہیں، نہیں، اس پر مسٹر یحییٰ بختیار پہلے ہی رائے دے چکے ہیں۔ لیکن اگر دوسرے حوالے سے کوئی اس پر وقت دینا چاہے تو اس سے اس پر روشنی پڑ سکتی ہے۔ لیکن دراصل یہ ہے کیا؟

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو :- تو مائی لارڈ .....

آنریبل چیف جسٹس :- بنیادی نکتہ یہ ہے کہ ہم آپ کی باتوں سے جو کچھ سمجھ سکے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ ہائی کورٹ کے دائرہ سماعت میں یہ بات نہیں آئی کہ وہ یہ رائے دے کہ آیا آپ نام کے مسلمان ہیں، حقیقت میں آپ ایک گہرا عقیدہ رکھنے والے سچے مسلمان ہیں۔ اس مقدمے کے فیصلے کے لحاظ سے یہ ایک مناسب اور برمحل بات تھی۔ سو آپ بات جاری رکھیے یہیں کارروائی آگے بڑھانی چاہیے۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو :- مائی لارڈ جیسا کہ میں اس سے پہلے کہہ چکا ہوں کہ ایک مسلمان کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ کلمے میں ایمان رکھتا ہو اور کلمہ پڑھتا ہو۔ اس حد تک بات جا سکتی ہے کہ جب ابوسفیان مسلمان ہوئے اور انہوں نے کلمہ پڑھا تو رسول ؐ کے بعض صحابہ نے سوچا کہ اس کی اسلام دشمنی اتنی شدید تھی کہ شاید ابوسفیان نے اسلام کو محض اوپری اور زبانی سطح پر قبول کیا ہو۔ لیکن رسول ؐ نے اس سے اختلاف کیا اور فرمایا، کہ جونہی اس نے ایک بار کلمہ پڑھ لیا تو وہ مسلمان ہو گئے۔ اس نقطۂ نظر سے اسلام کا نقطۂ نظر بہت سادہ ہے۔ یہ ایک بنیادی تصور ہے۔ اسلام بذات خود توکل، فروتنی اور تسلیم و رضا ہے۔ یہ بنیادی رضا جوئی ہے۔ اسلام مکمل رضا جوئی اور اطاعت کا نام ہے۔ یہ مذہب بنیادی طور پر توکل اور فروتنی کا نام ہے۔ عجز و انکسار و اطاعت اس کا بنیادی محور ہے۔

آنریبل جسٹس :- لیکن کیا انہوں نے آپ کے عقیدے پر رائے دی ہے یا آپ کے رویئے اور عمل پر، میرے خیال میں یہ بہت برمحل نکتہ ہے۔ "یہ ایک نام کا مسلمان ہے۔" میرا خیال ہے کہ پیراگراف ۶۱۱ یا ۶۱۰ ہے۔ ہاں ۶۱۱۔ یہ وہ پیراگراف ہے جس پر سب سے زیادہ اعتراض کیا گیا ہے۔ یہ پیراگراف ۶۰۹ سے شروع ہوتا ہے۔ پھر پیراگراف نمبر ۶۱۰ آتا ہے۔ فاضل جج نے جو اس کا مصنف ہے۔ وہ اس پر رائے دیتا ہے۔ اس طرح یہ ترکیب لفظی

پیراگراف ۱۱۶ تک پہنچتا ہے۔ یہ بالکل واضح ہے جیسے کہ وزیر اعظم نے وغیرہ وغیرہ ..... جب وہ بات جاری رکھتے ہیں جس کا جواز بھی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس کی مقدمے سے پوری مطابقت ہے۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو:- مائی لارڈ، یہ اس لیے مطابقت نہیں رکھتا کہ اختیار قادر مطلق نے اپنے بندوں کو تفویض کیا ہے۔ اور یہاں عوام کی حکومت ہے۔ لوگ اپنے حکمران چنتے ہیں کیونکہ یہاں امانت کا لفظ حکومت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ حکومت ایک ٹرسٹ ہے۔ اس کا یہ حصہ موزوں اور برمحل ہے کہ حکومت ایک ٹرسٹ ہے۔ اور یہ حکومت ہمیں ٹرسٹ یا امانت کی شکل میں سونپی جاتی ہے۔ جو عوام نے سونپے ہیں۔ کیونکہ یہ امانت عوام کی ہوتی ہے جسے وہ منتخب نمائندوں اور حکمرانوں کو تفویض کرتے ہیں۔ یہی قرارداد مقاصد ہوتی ہے۔ یہ عوام کا اعتماد ہوتا ہے جسے عوام ہی عوام کے ذریعے اپنے منتخب نمائندوں کو تفویض کرتے ہیں۔ اس لیے اصل نکتہ یہ ہے کہ عوام ہی اپنے حکمرانوں کا فیصلہ کرتے ہیں تو وہی حکومت کو آئینی حیثیت دیتے ہیں۔ ایک آئینی حکومت وجود میں آتی ہے۔ جس میں پھر عوام ہی اپنے منتخب نمائندوں کو ذمے داری اور حکومت تفویض کرتے ہیں۔ اس نقطہ نظر کے حوالے سے اسلام میں بھی ایک حکومت پر اعتماد اسی صورت میں ہوتا ہے کہ وہ ایک منتخبہ حکومت ہوتی ہے۔ اسلام میں کسی غیر منتخب حکومت کے لیے گنجائش نہیں ہے۔ جہاں تک ایک منتخب حکومت کا تعلق ہے تو پاکستان میں پہلی بار ۱۹۷۰ء میں قومی انتخابات ہوئے تھے۔ اور مجھے پاکستان کے عوام نے چُنا تھا۔

عدالت نے اس مرحلے پر خیال ظاہر کیا کہ مسٹر بھٹو کی حکومت کا طرز عمل اس مقدمے کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے کہا کہ مقدمہ چلانے والی عدالت کی ذاتی آرا ایک واضح تعصب کا اظہار ہیں۔

چیف جسٹس نے مسٹر بھٹو سے کہا کہ عوام اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے جو اعتماد حکومت کو سونپتی ہے۔ اس کی نوعیت پر اصرار کا اس عدالت کے سامنے کوئی موضوع

نہیں بنتا۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو، مَیں پاکستان کا پہلا رہنما تھا۔ جسے اسلامی تصوّر کے مطابق اختیارات سونپے گئے تھے۔ اس لیے میں عوام کے تفویض کردہ حق کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ ایک معزز جج نے کہا، اسلامی سربراہی کانفرنس کا انعقاد بھی آپ کے زمانے میں ہوا تھا.....

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو۔ اسلامی ...... ہاں صحیح معنوں میں حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی عوام نے پہلی بار اپنے رہنما کا انتخاب کیا تھا۔ اپنی پارٹی کا چناؤ کیا تھا۔ اور ہمیں اکثریت سے ہمکنار کیا۔ اور پاکستان کے عوام کی اکثریت مسلمان ہے اور انتخابات کے دوران میں انتہائی بدترین باتیں مخالفت میں کی گئی تھیں۔ ہمارے خلاف فتوے دیے گئے کیونکہ ہم ترقی پسند تھے۔ ہم اپنے معاشرے کے ہم عصر اور جدید معیارات اور مسائل پر یقین رکھتے تھے۔ فتوے یہ دیے گئے تھے کہ یہ شخص 'کافر' ہے یہ پارٹی 'کفر' ہے۔

اور فتوے صرف پاکستان کے علماء نے ہی نہیں دیئے تھے۔ بلکہ باہر کے بعض اہم علماء نے بھی ہمارے خلاف فتوے جاری کئے۔ ان فتووں کو ہمارے خلاف انتخابی مہم میں استعمال کیا گیا۔ اس سے قطع نظر، مَیں نے لاہور سے انتخاب علامہ اقبال کے صاحبزادے جاوید اقبال کے مقابلے میں لڑا۔ اور مَیں لاہور میں صرف ایک دن کے لیے آیا تھا۔ مَیں نے انہیں چالیس ہزار ووٹوں کی اکثریت سے شکست دی۔ اب لاہور کے عوام اندھے تو نہیں ہو گئے تھے کہ انہوں نے مجھے رجعت پسندوں اور ظلمت پسندوں کی شدید مخالفانہ مہم کے باوجود منتخب کیا اور فقید المثال اکثریت کے ساتھ چُنا۔

ملتان میں مَیں نے حامد علی کے مقابلے میں ستر ہزار ووٹوں کی اکثریت سے انتخاب جیتا۔ لوگوں نے خود، جو کہ مسلمان ہیں۔ کیونکہ لوگوں کی اکثریت مسلمان ہے۔ انہوں نے مجھے مسلمان کی حیثیت سے اپنا رہنما منتخب کیا۔ اس حیثیت سے مَیں نے اسلامی قانون شہادت کے مطابق صدر کا عہدہ سنبھالا۔ اسلام کے سماجی نظام مملکت اور سیاسی نظم و نسق کے مطابق۔ اس کے بعد ایسی رائے کی کیا تشریحات کی جا سکتی ہیں جو میرے بارے میں دی گئی

مَیں صرف اسی کی تمہید باندھ رہا ہوں۔

اسلام میں یہ ممکن نہیں ہے کہ اسلامی نظم ونسق کو تہہ وبالا کیا جاسکے۔یعنی اس میں آمریت کی کوئی گنجائش نہیں۔اسلام میں جمہوری نظام حکومت اپنایا جاتا ہے۔ایک ایسی حکومت ہوتی ہے جسے عوام انتخاب کرتے ہیں۔اور عوام ہی کے ذریعے اسے چنا جاتا ہے۔آمریت اسلام میں ہو ہی نہیں سکتی۔کیونکہ اسلامی تاریخ میں بنیادی جھگڑا ہی اس وجہ سے رہا ہے۔آخر کیا وجہ ہے کہ کسی غیر قانونی اور ناجائز عمل کو جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ایک ناجائز بچہ اپنے والدین کے لیے بوجھ ہو سکتا ہے لیکن اسے ورثے میں کچھ نہیں ملتا۔اسے جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔اسی طرح ایک ناجائز حکومت کو جائز حکومت نہیں بنایا جاسکتا۔

میں قانون کے مطابق بڑا مجرم نہیں ہوں۔یہ ایک گمراہ کن اصطلاح ہے۔ذرا یہ تو سوچیے کہ اس اصطلاح کا مسلسل دہرایا جانا یعنی چھ ماہ سے ایک ہی بات کی تکرار بنیادی اور بڑا ملزم اس کے عوام پر کیا اثرات مرتب ہوں گے۔

یہ فیصلے کی طرح آرٹ کی دنیا میں بھی تقریباً ایک اصطلاح کی طرح رائج کر دی گئی ہے اس میں بھی تعصب واضح ہے۔مجھے اصلی مجرم اور بدمعاش بھی کہا گیا۔مَیں یہاں جو کچھ بیان کر رہا ہوں وہ اس فیصلے کے مطابق ہے جس میں مجھے ایسا قرار دے کر ان القابات سے نوازا گیا۔

جناب والا اگر مجھے کہنے کی اجازت دی جائے تو میں کہوں گا کہ فیڈرل سیکورٹی فورس اس لیے تخلیق نہیں کی گئی تھی کہ مَیں ذاتی انتقام لینے کی تیاری کر رہا تھا۔فیڈرل سیکورٹی فورس اس لیے بنائی گئی تھی کہ یہ تمام وفاقی ممالک میں ہوتی ہے۔جو اصلاحی مقاصد پورے کرتی ہے۔یہی فیڈرل سیکورٹی فورس صوبوں کو ایک دوسرے کے ساتھ متحد کرتی ہے۔نظم ونسق کی اصطلاح میں ابتری کے دنوں میں اس کا کردار فعال ہوتا ہے۔فیڈرل سیکورٹی فورس کو مَیں نے تخلیق نہیں کیا تھا بلکہ اسے پاکستان کی پارلیمنٹ نے بنایا تھا۔جہاں اس بل پر پوری بحث ہوئی تھی۔

بلاشبہ استغاثہ کی طرف سے فیڈرل سیکورٹی فورس کے بارے میں بعض ایسی اسناد دی گئی ہیں تاکہ انہیں اس مقدمہ میں جو جھوٹا ہے سازش کی طرح میرے خلاف استعمال کیا جاسکے۔استغاثہ کے گواہ نمبر دو نے جو بھی رائے دی وہ اس کی اپنی نہیں بلکہ مستغیث کی رائے کو دہراتی

ہے۔ مستغیث قصوری نے یہی کچھ قومی اسمبلی میں کہا تھا۔ قومی اسمبلی کے بیان اور استغاثہ کے بیان میں جھوٹی سازش کے بارے میں جو مماثلت پائی جاتی ہے وہ قابل توجہ ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ فیڈرل سیکورٹی فورس کا ایک مقصد تھا کہ میرے جلسوں کی حاضری بڑھائیں۔

مائی لارڈ فیڈرل سیکورٹی فورس کا قیام پانچ ہزار سے سات ہزار افراد پر ہوا۔ جو بالآخر بڑھتے ہوئے آخری حد تک تقریباً اٹھارہ ہزار کی نفری تک پہنچا۔ پاکستان کے بڑے شہروں جیسے کراچی، لاہور، ملتان میں اٹھارہ ہزار یا پانچ ہزار یا سات ہزار افراد کی حیثیت سمندر میں ایک قطرے کے برابر ہوتی ہے اور پھر کم از کم یہ بات سب کے علم میں ہے کہ میرے لیے یہ کبھی مسئلہ نہیں رہا کہ میری تقریر سننے کے لیے لوگوں کو جلسوں میں جمع کرنے کی کسی خاص فورس کے ذریعے کوشش کی جائے۔ کیونکہ میری تقریر سننے کے لیے عوام خود ہی ہمیشہ سے کھنچے چلے آتے ہیں۔

(مقدمہ چلانے والی عدالت نے اپنے فیصلے میں رائے دی تھی کہ مسٹر بھٹو فیڈرل سیکورٹی فورس کو اپنے ذاتی انتقام کے لیے استعمال کرتے تھے۔ جس شخص کو وہ اپنا دشمن سمجھتے تھے اس سے بدلہ لینے کے لیے فیڈرل سیکورٹی فورس کو بروئے کار لایا جاتا تھا۔ مسٹر بھٹو نے اپنے مقاصد کے لیے فیڈرل سیکورٹی فورس کے افراد کو مجرم اور کرائے کے قاتل بنا کر انہیں استعمال کیا تھا۔ مسٹر بھٹو نے فیصلے کی اس شق پر دلائل دیتے ہوئے کہا کہ عدالت نے جو نتائج اخذ کیے وہ غلط تھے اور فیڈرل سیکورٹی فورس کو اپنا آلہ کار بنانے کا الزام بے بنیاد اور جھوٹا ہے فیڈرل سیکورٹی فورس اور اس کے چارٹر کو مسٹر بھٹو نے نہیں بلکہ پارلیمنٹ نے وزیر اعظم کے استعمال کے لیے مرتب کیا تھا۔ استغاثہ کے گواہ نمبر دو نے جھوٹ بولا تھا کہ فیڈرل سیکورٹی فورس کے عملے کے لیے مسٹر بھٹو کی ذاتی وفاداری کا حلف لینا پڑتا تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ اور جو کچھ ہوا وہ پارلیمانی سطح پر طے کیا گیا تھا۔ عدالت نے جو یہ لکھا ہے کہ فیڈرل سیکورٹی فورس کے بعض افراد اس ذاتی حلف وفاداری پر نادم اور شرمندہ تھے اور بعض اوقات جب وہ نوجوانوں کو اپنا نشانہ بناتے تھے تو بھی نادم ہوتے تھے کہ وہ معمر ہونے کے باوجود اپنے سے چھوٹوں پر ظلم کر رہے ہیں۔ ایسے تمام الزامات جو فیڈرل سیکورٹی فورس کے حوالے سے مسٹر بھٹو پر لگائے گئے انہوں نے انہیں غلط اور نادرست قرار دیا۔ فیڈرل سیکورٹی فورس مسٹر بھٹو کے

تابع نہیں تھی بلکہ وزارت داخلہ کے ماتحت تھی۔)

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو مائی لارڈ۔ یہ قوم ستّر ملین عوام پر مشتمل ہے۔ یہ ایک غریب ملک ہے دنیا کے انتہائی ترقی یافتہ ممالک میں بھی جرائم ہوتے ہیں۔ دنیا میں کہیں بھی قانون اور نظم و نسق کی حالت بہتر نہیں ہے۔ کہیں بھی ایسے مثالی حالات نہیں ہیں جن میں کوئی معاشرہ اپنا عمل پورا کر رہا ہو۔ ہر جرم اور ہر غلطی کو اس ملک کے صدر یا وزیر اعظم پر تھوپا نہیں جا سکتا۔ ہر وہ بھیانک جرم یا غلط کاری جو کسی ملک میں ظہور کرتی ہے اس سے یہ مفہوم نہیں لیا جا سکتا کہ اس ملک کا صدر یا وزیر اعظم اس ملک کو گھٹیا اور غلط انداز میں چلا رہا ہے۔ اٹلی جیسے ملکوں میں دیکھیے کس طرح قانون اور نظم و نسق کے پرخچے اڑا دیئے گئے ہیں۔ ہر وہ جگہ جو تاریخی اہمیت رکھتی ہے اور اس کے تاریخی اسباب ہیں وہاں جدھر دیکھیں وہاں دہشت پسند سرگرم عمل نظر آتے ہیں۔ اگر آپ ایک ٹینک کو کسی بازار میں لے آتے ہیں تو اس کے نتیجہ میں دہشت گردی شروع ہو جاتی ہے۔

ایسے تمام واقعات اور مسائل ایسے نہیں ہوتے کہ انہیں کسی صدر یا وزیر اعظم کے سر تھوپ دیا جائے۔ آلدو مورو کو ریڈ بریگیڈ نے اغوا کیا اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا تو کیا یہ جرم اطالوی حکومت کے کھاتے میں ڈال دیا گیا۔ کیا اٹلی کے وزیر اعظم کو اس اغوا اور ہلاکت کا ذمہ دار قرار دیا گیا۔ مائی لارڈ میں ایسی بے شمار مثالیں پیش کر سکتا ہوں۔

یہاں اپنے ملک میں گذشتہ اٹھارہ ماہ سے مارشل لا اور اس کے احکام نافذ ہیں۔ مارشل لا سب سے برتر ہے اور ہم سب دیکھتے ہیں کہ مارشل لا کے ہوتے ہوئے اس ملک میں جرائم میں کتنا خوفناک اضافہ ہوا ہے۔ ذرا ڈکیتی اور اغوا کی وارداتوں میں اضافے کو دیکھیے۔ اس کے علاوہ یہاں سیاسی قتل بھی ہو رہے ہیں۔ بہاولپور میں مخدوم زادہ حسن محمود کے بھائی کو دن دہاڑے گولی مار دی گئی۔ ایک اہم قبائلی رہنما مراد جمیل کو کوئٹہ میں قتل کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ جماعت اسلامی کے بعض لوگوں کو سانگھڑ میں قتل کر دیا گیا۔ یہ سارے واقعات مارشل لا کی حکومت میں رونما ہو رہے ہیں تو کیا آپ یہ سارے جرائم چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے سر لگا دیں گے۔ خاص طور پر ایک ایسا انتہائی با اختیار مطلق العنان منتظم اعلیٰ جو کسی کے سامنے جواب دہ نہیں نہ عوام کے

سامنے نہ پارلیمنٹ کے سامنے نہ کسی اور کے سامنے یہ تمام جرائم اس منتظم اعلیٰ کے کھاتے میں نہیں ڈالے جا سکتے۔

آنریبل چیف جسٹس ٹھیک ہے آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ ایسے معاملات کا کوئی جواز نہیں اور حکومت کا سربراہ ایسے اعمال کا ذمہ دار نہیں ہوتا۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو جی ہاں ایسے ہر اعمال کا وجود وقوع پذیر ہوتے ہیں۔

آنریبل چیف جسٹس ٹھیک ہے لیکن پیراگراف نمبر ۱۱ کے مطابق وزیر اعظم کے حلف سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ......

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو ہاں مائی لارڈ یہ بہت اہم نکتہ ہے۔

آنریبل چیف جسٹس ہاں یہ کہ پاکستان کا وزیر اعظم لازمی طور پر ایک مسلمان ہو گا۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نہ صرف مسلمان بلکہ قرآن پاک اور سنت کی تعلیمات میں کلیتاً عقیدہ رکھنے والا وہ صرف نام کا مسلمان نہیں ہونا چاہیئے ورنہ وہ اپنے فرائض صحیح طرح سے انجام نہیں دے سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ میں حلف کے پہلے حصے کا ذکر کر رہا تھا کہ وزیر اعظم کا محض رسمی مسلمان ہونا کافی نہیں ہوتا۔ تاہم اس کا مسلمان ہونا ضروری ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر اس کے لیے کافی ہے کہ وہ کلمہ گو ہو اور اس کا دعویٰ ہو کہ وہ اس کلمہ پر ایمان رکھتا ہے اسی لیے میں مثالیں پیش کر رہا تھا۔ یہ برمحل نکتہ ہے۔ اور پھر اس حقیقت سے قطع نظر نہ صرف یہ کہ بلکہ مسلم معاشرے میں عوام بھی اسے ایک مسلمان تسلیم کرتے ہوں۔ پاکستان میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور انہی مسلمانوں کی اکثریت نے مجھے ایک مسلمان رہنما کی حیثیت میں قبول کیا۔

یہ اصلی صورت حال ہے۔ جب آپ مجھ پر الزام لگاتے ہیں تو مجھے ذلیل نہیں کرتے بلکہ آپ پاکستان کے عوام کو ذلیل کرتے ہیں۔ جب مجھے نام کا مسلمان کہا جاتا ہے، تو در اصل ان عوام کو یہ الزام دیا جاتا ہے کہ وہ اچھے مسلمان نہیں بلکہ نام کے مسلمان ہیں۔ یوں صرف مجھے ہی نہیں ان تمام مسلمانوں کو نام کا مسلمان کہا جا رہا ہے جنہوں نے مجھے منتخب کیا۔ انہی لوگوں نے مجھے اور میری پارٹی کو منتخب کر کے اسمبلیوں تک پہنچایا اور آنے والے کل میں بھی عوام یہی کریں گے اور انہی کی توہین کی جا رہی ہے۔ یہ پوری آبادی پر ایک الزام ہے کہ انہوں نے ایک ایسے

شخص کو منتخب کیا جو نام کا مسلمان ہے۔ جو اسلام پر یقین نہیں رکھتا یہ صرف اسی شخص پر ہی حملہ کر کے توہین نہیں کی گئی جسے منتخب کیا گیا تھا بلکہ ان لوگوں کی بھی توہین کی گئی ہے جنہوں نے ایسے شخص کو منتخب کیا تھا۔

تعصب اور ایک طرفہ جھکاؤ کے اس حوالے سے کہ میں ایک اچھا مسلمان نہیں تھا۔ میرے انتخاب کو نظر انداز کر دیجیئے۔ ہر ایک چیز کو چھوڑ دیجیئے اگر ایسا ہوتا تو مولانا مودودی کبھی ہمارے گاؤں نہ آتے اور تین ماہ تک ہمارے مہمان کی حیثیت سے وہاں رہ کر ہمارے ایک حکیم سے کبھی اپنا علاج نہ کراتے۔ میں کبھی ان کے گاؤں نہ جاتا میں کبھی ان کے گاؤں نہیں جاؤں گا اگر مجھے یہ یقین نہ ہو کہ وہ مسلمان ہیں۔

آنریبل چیف جسٹس ہم نے پہلے یہ واقعہ کبھی نہیں سنا۔

ایک آنریبل جج یہ واقعہ کب ہوا؟

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو ۱۵ یا ۱۶ ۵ کی بات ہے۔ انہیں گردے کی تکلیف تھی اور ہمارے یہاں ایک بہت اچھا حکیم تھا۔ مولانا مودودی ہمارے گاؤں آئے وہاں انہوں نے اپنا علاج کروایا اور انہوں نے ہمارے ہاں قیام کیا۔

آنریبل چیف جسٹس ہو سکتا ہے کہ اس زمانے میں وہ آپ کے عقیدے سے باخبر نہ ہوں۔

مسٹر ذوالفقار علی مائی لارڈ ہر شخص اس بات کو جانتا ہے وہ اس سے پوری طرح باخبر تھے۔ آپ از راہ عنایت ان مساجد کی تعداد پر ایک نگاہ ڈالیئے جو ہم نے اپنے علاقے میں تعمیر کروائیں۔ میرے گاؤں میں چوبیس گھنٹے قرآن خوانی ہوتی ہے۔

ایک معزز جج آپ کو اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو چوبیس گھنٹے ہمارے ہاں قرآن پاک کی تلاوت ہوتی ہے اس لیے یہ بات میرے لیے بہت اذیت ناک بن گئی ہے۔ مائی لارڈ آپ میری جگہ نہیں کھڑے ہیں آپ نہیں جانتے کہ ان ریمارکس نے مجھے کتنا دکھ پہنچایا ہے۔ اس کے مقابلے میں تو میں پھانسی کو ترجیح دوں گا۔ اس الزام کے بدلے میں پھانسی کے پھندے کو قبول کروں گا۔

ایک ایسا شخص جو پاکستان کی تحریک میں پندرہ سال کی عمر سے شریک رہا ہے جسے ۱۹۴۶ء میں پنڈت نہرو نے کہا تم پاکستان کیوں چاہتے ہو۔ تم متحدہ ہندوستان کے وزیراعظم بن سکتے ہو۔ تم بے حد ذہین انسان ہو۔ مَیں نے کہا تھا۔ مَیں ایک اسلامی ریاست چاہتا ہوں۔ ایک مسلم ریاست۔ ہم ایک مسلم ریاست کے حصول کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ مجھے متحدہ ہندوستان نہیں چاہیئے۔ اس لیے میرے احساسات کو تکلیف پہنچتی ہے کہ ایک ایسا شخص جس نے آغاز سے ہی اس عمر ہی سے جب اس نے سوچنا شروع کیا تھا اپنے آپ کو پاکستان کی تحریک میں شامل کیا۔ قائداعظم کی تحریک میں، قائداعظم کے تصور پاکستان کی تحریک میں ایسا شخص یہ کس طرح برداشت کر سکتا ہے کہ اس پر اتنا بڑا گھناؤنا الزام لگایا جائے۔ قائداعظم نے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں جو اپنی پہلی تقریر کی وہ ایک سیکولر تقریر تھی۔ ایک جدید تقریر ایک ترقی پسند تقریر۔ مساوات پر مشتمل تقریر اور آج انہیں ہی مسخ کیا جا رہا ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے پاکستان کی مخالفت کی جنہوں نے اس کے قیام کو ناممکن بنانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا وہی اس ملک پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ انہی لوگوں نے قائداعظم کو کافر اور نام کا مسلمان کہا تھا۔

آنریبل چیف جسٹس لیکن یہ وہ لوگ نہیں ہیں جنہوں نے یہ فیصلہ دیا ہے اگر آپ چاہیں تو ہم کارروائی جاری رکھیں۔ آپ پیرا نمبر ۶۱۲ پر بات کریں۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے تسلیم کیا کہ اسلام مراعات یافتہ طبقات میں یقین نہیں رکھتا اور پاکستان پیپلز پارٹی انہی مراعات یافتہ طبقوں کے خلاف لڑ رہی ہے۔ جنہوں نے سماج کا استحصال کیا ہے۔ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے یہ بھی کہا کہ مقدمہ چلانے والی لاہور ہائی کورٹ کا چیف جج بھی اسی استحصالی مشین کا ایک پرزہ ہے۔ وہ مراعات یافتہ ہے۔ کیونکہ وہ چیف الیکشن کمشنر بھی ہے۔

اس گفتگو کے دوران یہ بھی کہا گیا کہ جو مقدمے چلانے والی عدالت نے حضرت ابوبکرؓ کے حوالے سے کیا تھا۔ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے جواب دیا کہ حضرت ابوبکرؓ جس بات پر عمل کرتے تھے۔ یہ فوجی ٹولہ محض اس کی زبانی تبلیغ کر رہا ہے۔ اور یہ چیز بہت خطرناک اور

تکلیف وہ ہے کہ فوجی ٹولہ مراعات یافتہ طبقوں کے خلاف باتیں کرتا ہے۔ عملی طور پر وہ نجی شعبے کا تحفظ کر رہا ہے۔ اس کی معاونت میں شریک ہے۔

چیف جسٹس نے رائے دی کہ جو فیصلہ صادر کیا گیا ہے وہ لاہور ہائی کورٹ نے کیا تھا۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے کہا بطور چیف الیکشن کمشنر کے چیف جسٹس (لاہور ہائیکورٹ) بھی انتظامیہ کا ایک حصہ ہے۔

چیف جسٹس نے اعتراض کیا کہ فیصلہ مولوی مشتاق حسین نے بحیثیت ایک چیف جسٹس دیا تھا نہ کہ الیکشن کمشنر کی حیثیت سے۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے کہا کہ فیصلے کے پیراگراف ۶۱۲، ۶۱۴ اور ۶۱۵ میں جو وعظ کیا گیا ہے۔ اس پر انتظامیہ خود عمل نہیں کرتی اور اس کے علاوہ یہ کہ یہ پیراگراف "تعصب کا واضح طور پر اظہار کرتے ہیں" اور یہی تعصب پورے مقدمے میں کار فرما دکھائی دیتا ہے۔

سوال وجواب کے مزید مراحل کے بعد مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"میں اپنے آپ کو ایک عاجز مسلمان سمجھتا ہوں۔ جب میں پاکستان کا صدر اور وزیر اعظم تھا تو پاکستان میں اسلامی سربراہی کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ اور شاہ فیصل جو اس وقت سعودی عرب کے فرمانروا تھے۔ حرمین شریف کے محافظ تھے جو اسلام کے مقدس ترین شہروں میں واقع ہیں۔ انہوں نے تجویز کیا کہ مجھے اسلامی سربراہی کانفرنس کا چیئرمین بنایا جائے۔ ایک تجویز جو خود شاہ فیصل نے پیش کی۔ جسے متفقہ طور پر قبول کیا گیا اور اس میں شریک ہونے والے تمام افراد نے رضامندی کا اظہار کیا۔ مجھے محض اسلامی سربراہی کانفرنس کے اجلاس کا ہی چیئرمین منتخب نہ کیا گیا تھا بلکہ میں اب بھی اسلامی کانفرنس کا چیئرمین چلا آرہا ہوں۔ اگر اسلامی کانفرنس کا انعقاد کل ہو تو میں اس کی صدارت کر رہا ہوں گا۔ مگر کیسے! بے شک اس کے لیے انتظامات یور لارڈ شپس کریں گے۔

آنریبل چیف جسٹس: جب تک وہ نیا چیئرمین منتخب نہیں کرتے تب تک سابق

صدر لازماً ....

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو :۔ ایک نئے چیئرمین کو چنا جا سکتا ہے ۔ پہلے موجود صدر کرسی صدارت سنبھالے گا ۔ پھر کوئی تجویز پیش کرے گا ۔ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ شاہ فیصل نے مجھے صدر بنانے کی تجویز پیش کی تھی ۔

آزیبل چیف جسٹس :۔ لیکن کیا یہ عام بات نہیں ہوتی کہ میزبان ملک ......"

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو :۔ یہ ضروری نہیں ہوتا ۔ میں اسی سوال کی توقع کر رہا تھا ۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاہ فیصل جو بہت باخبر انسان تھے اور مجھے ۱۹۵۸ء سے جانتے تھے ۔ اگر انہیں کسی طرح کے شکوک ہوتے اگر ان پران خیالات کے اثرات ہوتے جو پیراگراف نمبر ۶۰۹ سے ۶۱۵ میں ظاہر کیے گئے ہیں تو وہ شاہ فیصل بہت نرمی سے کہتے کہ اسلامی کانفرنس پاکستان میں کیوں کی جا رہی ہے ۔ وہ موضوع کو کسی دوسری راہ پر ڈال دیتے اور کہتے کہ اسلامی سربراہی کانفرنس کسی دوسرے ملک میں منعقد ہو ۔ دنیا میں بہت سے اسلامی ممالک موریطانیہ سے مراکو اور انڈونیشیا تک پھیلے ہوئے ہیں ۔ وہ کسی دوسرے ملک کا انتخاب کر سکتے ہیں ۔ تہران کانفرنس کے انعقاد میں گہری دلچسپی لے رہا تھا ۔ قاہرہ بہت دلچسپی کا اظہار کر رہا تھا کہ وہاں کانفرنس منعقد ہو ۔ لیکن شاہ فیصل نے اصرار کیا کہ اسلامی سربراہی کانفرنس کا انعقاد پاکستان میں ہونا چاہیے ۔

اور صرف یہی نہیں بلکہ میری اسلامی خدمات کے حوالے سے انہوں نے مجھے خراج تحسین پیش کیا ۔ محض اتنا ہی نہیں ہوا تھا کہ انہوں نے کہا ہو کہ میں مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کا نام تجویز کرتا ہوں ۔ لیکن انہوں نے اس کے لیے دلائل پیش کیے ۔ میری ان خدمات کا اظہار کیا جو میں نے فلسطین کے نصب العین اور اسلام کے نصب العین کے لیے انجام دی تھیں ۔ ان خدمات کے حوالے سے انہوں نے میرا نام تجویز کیا تھا ۔ اگر انہیں خیال ہوتا کہ میں ایک اچھا مسلمان نہیں ہوں پھر وہ کہتے " اسلامی کانفرنس کا انعقاد قاہرہ ، بغداد ، دمشق میں ہونا چاہیے ۔ یہ کانفرنس بہت سے ممالک میں ہو سکتی تھی ۔ کیونکہ وہ اس کے شریک سرپرست تھے ۔ اور جو فیصلہ ہوا وہ متفقہ تھا ۔ یہ پہلی اور آخری اسلامی سربراہی کانفرنس جو بطور ایک قوم کے ہماری تاریخ

میں پاکستان میں منعقد ہوئی۔

اور پھر نوے سالہ پرانے احمدیت کے مسئلے کو اسی وقت خوش اسلوبی سے طے کیا گیا۔ جب میں وزیرِ اعظم تھا۔ یہ مسئلہ بھی متفقہ طور پر طے پایا اور پھر آئین کو لیجیے ۱۹۷۳ء کا آئین۔ جو تمام جمہوری طاقتوں کے اجماع کا ایک متفقہ آئین ہے۔ اس آئین میں اسلام کے بارے میں جو شقیں ہیں آپ انہیں بخوبی جانتے ہیں۔ اس میں اسلامی نظریاتی کونسل موجود ہے۔ مختلف پہلوؤں کے حوالے سے اس میں سب کچھ موجود ہے۔ اور اس سے بھی قطع نظر، سیرت کانفرنسوں اور دیگر معاملات کو دیکھیے۔ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار حج سب کے لیے آزادی سے کرنے کا اہتمام کیا گیا۔ حج کا فریضہ ادا کرنے کے لیے پاکستان کے عوام کے لیے کوٹہ سسٹم کا خاتمہ کر دیا گیا۔ جمعہ جو کہ تعطیل کا دن نہیں بلکہ یوم کار تھا۔ برطانیہ کے دور سے ۱۹۷۷ء تک۔ اسے ایک تعطیل قرار دیا گیا۔ یہ کام میری حکومت نے کیا۔ اس سے پہلے اتوار گھسیٹ کا دن ہوتا تھا۔ ریڈ کراس (صلیب احمر) کو میں نے ہلال احمر میں تبدیل کیا۔ پہلی تمام حکومتوں نے کہا تھا کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ اسے ہلال احمر میں تبدیل کیا جا سکے۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۴ء تک یہ ریڈ کراس ہی رہا۔ ۱۹۵۸ء میں جب میں وزیر تھا یہ مسئلہ اٹھایا گیا تھا۔ مگر یہ دلائل دیے گئے کہ نام تبدیل کرنا ممکن نہیں ہے۔ جب ہم اقتدار میں آئے تو ہم نے کہا کہ یہ ممکن ہے۔ ہم نے اسے ہلال احمر میں تبدیل کر دیا۔ شراب نوشی میرے زمانے میں ختم کر دی گئی۔ آنے والی نسلیں بتائیں گی یہ اچھا فیصلہ تھا یا برا۔ بہر حال ہم نے اس پابندی کا نفاذ کیا۔ اب آپ شراب کی اس مقدار کا اندازہ کیجیے جو ناجائز طور پر انڈیا سے آ رہی ہے۔ اور ہمارا کتنا زرمبادلہ محض اس شراب کے لیے انڈیا جا رہا ہے۔

آنریبل چیف جسٹس:۔ کیا آپ کا اس کے بارے میں کوئی دوسرا خیال نہیں ہے۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو:۔ میں اس سلسلے میں بہت گہرا اور سنجیدہ خیال رکھتا ہوں۔ کیونکہ میرے نزدیک یہ خدا اور انسان دونوں کے خلاف ایک گناہِ عظیم ہے۔

آنریبل چیف جسٹس:۔ آدمی اور خدا، ہاں۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو:۔ یہ ایک ایسا جرم نہیں ہے جو انسان اور انسان کے درمیان ہو۔

آنربیل چیف جسٹس:۔ ہاں ۔ یہ انتہائی سرمستی کی طرف لے جاتا ہے ۔

محرکات

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو:۔ مائی لارڈ محرک بالعموم بہت اہمیت رکھتا ہے ۔ لاہور ہائیکورٹ نے جو فیصلہ دیا ہے ۔ اس میں اور اس مقدمے میں محرک کو بہت ہی اہم بنا دیا گیا ہے ۔ خاص طور پر ان آرا کے حوالے سے جو اس فیصلے میں دی گئی ہیں اور یہ کہ مجھے اس میں بنیادی ملزم اور مہا مجرم کہا گیا ہے ۔ لیکن کیا واقعی ان دلائل اور محرکات کا کوئی تعلق یا دھاگہ ثابت بھی ہوتا ہے ۔ یہ تعلق بہت باریک یا بہت موٹا ہے اور میرے بارے میں مسعود محمود کے حوالے سے جو کچھ بحث کی گئی ہے ۔ اس میں تو یہ تعلق بہت ہی اہم بنا دیا گیا ہے ۔ اس قسم کی بات ہی میں نے اپنی شکایت میں یہاں کی تھی ۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر میرا کوئی آزادانہ محرک ہوتا اور میں اسے یور لارڈشپس کے سامنے اسے قائم کرنے میں کسی طرح کامیاب بھی ہوا ، تو اب کوئی تعلق باقی نہیں رہا ۔ وہ ٹوٹ چکا ہے ۔ کیونکہ اس کے بعد جو کچھ ہوا ۔ اس کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں ہے ۔ میں اس سے متعلق نہیں ہوں ۔ میں اس میں ملوث نہیں ہوں ۔ حقیقت یہی ہے ۔ ایک بار قانونی نقطۂ نظر سے پیش نہیں ہو لہر حال یہ کہا گیا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ مسعود محمود کا کوئی اپنا ذاتی مفاد اور محرک ہو ۔ جس کی وجہ سے اس نے اس جرم کا ارتکاب کیا ہو ۔ اس پر سرکاری وکیل نے کہا تھا کہ اس سے آدھا مقدمہ حل کر دیا گیا ہے ۔ آپ کا آدھا مقدمہ جو ثابت ہوا ہے وہ کس کے خلاف ثابت کیا گیا ہے ؟ شاید مسعود محمود کے خلاف ۔ یا پھر ان شریک ملزموں کے خلاف جنہوں نے اعتراف کیا ہے ۔ لیکن میرے خلاف نہیں ۔ یہ میں اس لیے کہتا ہوں کہ وکیل دفاع کو یہ رعایت نہیں دی گئی کہ وہ اسی جرم یا اس کے محرکات کے بارے میں مخالف وجوہات بیان کر سکے ۔ شہادتوں اور گواہوں کا مفہوم یہاں استغاثہ کی گواہیاں لیا گیا ہے ۔ گذشتہ روز میں نے اس بتائے گئے مقدمے کا ذکر وادین میں کیا تھا ۔ جس کے بارے میں ماتحت عدالت نے حکم جاری کیا تھا ۔ کیا آپ اس کو وادین میں کس طرح ثابت کر سکتے ہیں ۔ جبکہ صفائی نے ایسی درخواست دی ہو جو جعلی یا جھوٹی ہو ۔ یہ استغاثہ کا فرض ہے کہ وہ کسی

شک و شبہے سے ماوراء ہو، معقول دلائل اور وجوہات سے ثابت کرے کہ یہ سب کچھ بنایا ہوا جھوٹا اور جعلی ہے۔

اس لیے نکتہ یہ ہے کہ ہم نے تو کسی صورت میں بھی، اس نظریے کا متبادل پیش نہیں کیا۔ یا کوئی "ممکنہ نظریہ"، یا کوئی "ممکنہ محرک یا اس وجہ کا کوئی "متبادل"، ہم تو اس سلسلے میں خاموش رہے۔ یہی نہیں بلکہ دوستی کے لیے میں تو یہ ہی کہوں گا کہ اگر ہم ولنگٹن کیس کو بھی قبول کر لیتے ہیں کہ میں نے ایک بندوق اٹھائی، میں نے اپنی بیوی کو گولی مار دی۔ تب بھی قانون کے اعتبار سے یہ جھوٹ اور فریب ہے۔ قانون کے دوسرے پہلوؤں سے دیکھیے کہ یہ آزمائش نہیں ہو سکی تو پھر یہ مقدمہ ناکام ہو چکا ہے۔ اس لیے یہ ریمارک کہ آدھا مقدمہ ثابت ہو چکا ہے قانون کے مطابق نہیں ہے۔ یہ ایک رائے کا اظہار ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ قانون کا اظہار نہیں ہے اب فیصلے کا پیراگراف نمبر ۲۱۶ لیجئے جس میں محمد اصغر خاں کا حوالہ دیا گیا ہے جو اس وقت لاہور کا ایس ایس پی تھا۔ اس میں کہا گیا ہے "اس نے نہایت مناسب جواب اس سوال کا دیا کہ کیا گواہوں کے بیانات قلم بند کیے گئے تھے۔ اس نے بیان دیا کہ اندھے قتل کے مقدمے کی تحقیقات محرکات کی بنیادوں پر کی جاتی ہیں۔" تو محمد اصغر خاں ایس ایس پی لاہور یہ کہتا ہے کہ ایک اندھا قتل کا کیس ہے۔ اور جب تک ہم محرک کو سامنے نہ رکھیں کارروائی نہیں کی جا سکتی اور وہ اس سے آگے یہ کہتا ہے کہ اس واردات میں محرک بہت واضح تھا۔ جیسے واضح طور پر احمد رضا قصوری نے پہلی ایف آئی آر میں درج کرایا تھا۔ اس لیے اس واردات کی تحقیقات اور پوچھ گچھ بنیادی اور بڑے ملزم سے ہی کی جائیں گی۔ جس کا نام ایف آئی آر میں درج کرایا گیا لیکن اس وقت وہ خود یا اس کے ماتحت اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ وہ وزیرِ اعظم سے پوچھ گچھ کر سکیں۔ اس لیے تسلی بخش یا غیر تسلی بخش ہونے کا مسئلہ غیر مناسب ہے۔

اس نام نہاد اندھے قتل میں محرک میرے نام منسوب کر دیا گیا۔ لیکن میرے بارے میں تحقیقات نہ ہو سکتی تھیں کیونکہ میں وزیرِ اعظم تھا۔ اس لیے تسلی بخش طور پر تحقیقات نہیں ہو سکتی تھیں۔ اب آپ پیراگراف نمبر ۲۱۶ کو پیراگراف نمبر ۵۰۶ سے ملا کر پڑھیے۔ جو ماتحت عدالت نے اپنے فیصلے میں لکھے ہیں کہ "میں استغاثے کے گواہ نمبر ۱۲ محمد اصغر خاں سے قطعی طور

پر متفق ہوں۔ شروعات کرنے کے لیے تحقیقاتی افسر کے لیے بڑے ملزم تک اس کی رسائی لازمی تھی۔ حالانکہ اس کا نام ایف آئی آر میں درج تھا۔" اب یہ محض لاہور کے ایس ایس پی کا پیشہ وارانہ نقطۂ نظر ہی نہیں ہے۔ بلکہ فیصلے میں یہ کہا گیا ہے کہ ہم اس پر قطعی طور پر متفق ہیں کہ یہ قتل کی ایک اندھی واردات ہے اور تسلی بخش طریقے سے تحقیقات ہونی چاہئیں۔ اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ جب تک مجھ سے پوچھ گچھ نہ کی جائے۔

ایک آنریبل جج :۔ پہلے پوچھ گچھ ......

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو :۔ دوسرا کوئی مناسب قدم اٹھانے سے پہلے پوچھ گچھ کا مرحلہ آتا ہے۔ میں اس نظریہ شرط کی حمایت کرتا ہوں۔ تاہم مجھ سے پوچھ گچھ مشروط ہے۔ مائی لارڈ اس کے بعد پیراگراف نمبر ۲۱۶ آتا ہے۔ جہاں ڈی آئی جی جو ایس ایس پی سے بڑا افسر ہے۔ براہِ راست چوہے کی بُو سونگھ لیتا ہے۔ اس لیے آپ اسے اندھا قتل نہیں کہہ سکتے۔ ڈی آئی جی ایس ایس پی کی رائے سے برعکس رائے دیتا ہے۔ وہ ایس ایس ایف تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ فوراً سونگھ لیتا ہے کہ اس میں ایس ایس ایف ملوث ہے۔ سب سے پہلے تو میں یہ کہوں گا کہ ایس ایس پی اور ڈی آئی جی کے بیانات میں واضح تضاد ہے۔ ڈی آئی جی فوراً یہ سوچ لیتا ہے کہ اس میں کسی نہ کسی حد تک ایس ایس ایف ضرور شریک ہے۔ لیکن ہائی کورٹ ایس ایس پی کے ساتھ اتفاق کرتی ہے۔

اب میں مزید اس سلسلے میں یہ کہوں گا کہ ہائی کورٹ کو یہ آزادی حاصل ہے کہ ایک رائے کو قبول کرے اور کسی دوسری رائے پر رضامند نہ ہو۔ میں یہ بھی کہوں گا کہ اگر یہی پوزیشن ہے تو پھر منطقی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ جب مارشل لاء کے بعد اس کیس کی تحقیقات از سرِ نو شروع کی گئیں اس نقطۂ نظر سے کہ وہ افسران ابھی تک اپنے عہدوں پر موجود ہیں۔ یا پھر تحقیقاتی افسر جنہوں نے از سرِ نو تحقیقات کا آغاز کیا۔ انہیں سب سے پہلے میرے پاس آنا چاہیے تھا کیونکہ یہی مثالی شرط ہے۔ اور اگر اس شرط اور صورت میں کہ پہلے مجھ سے پوچھ گچھ نہیں کی گئی تھی اور اس واردات کا کوئی سراغ نہ ملا تھا تو انہیں براہِ راست میرے پاس آنا چاہیے تھا اور مجھ سے پوچھ گچھ کرنی چاہیے تھی اور میں ان کے لیے موجود تھا۔

لیکن مجھ سے پوچھ گچھ نہیں کی گئی۔ اس کے برعکس اندازے کے مطابق جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ محمود مسعود کے اعتراف نامے (۱۳ یا ۱۴ اگست کو اور دوسری نشوونما ہو رہی تھی۔) حاصل کیے جا رہے تھے۔ اس وقت میں راولپنڈی میں تھا۔ ۲۸ اگست کو مجھے دعوت دی گئی اور کہا گیا کہ میں اپنے تجربے کی وجہ سے اس ملک کا مناسب اور بہترین شخص ہوں۔ جو انہیں بتا سکتا ہے کہ اب آئین کی کیا شکل ہو سکتی ہے۔ یاد رکھیے اس کے چند روز بعد مجھے گرفتار کیا جانے والا ہے اور مجھے کہا جاتا ہے کہ "آپ ایک قومی خدمت انجام کیوں نہیں دیتے اور ایک ایسا مسودہ کیوں تیار کر کے نہیں دیتے جو عمومی اصولوں پر مشتمل ہو۔" میں نے انہیں بتایا کہ اب یہ میرا منصب نہیں رہا۔ میں نے اس سے انکار کر دیا۔ لیکن یہ وہ "طریقۂ کار" تھا جس سے تحقیقات کی گئیں۔

سب کچھ اپنی سپرداری میں لے لیا گیا۔ سب کو محفوظ گھروں میں لے جایا گیا اور پھر چار ہفتوں یا چھ ہفتوں کے بعد کسی نے ایک سو صفحات پر مشتمل ایک بیان تیار کیا۔ جس میں اپنا "سینہ صاف کر دیا"۔ ایک دوسرے نے تیس صفحات کا بیان دے کر "سینہ صاف کر دیا" اور بہت سے لوگوں سے تحقیقات کی گئیں۔ ان کے بیان قلم بند کیے گئے۔ لیکن مجھے اس تصویر میں نہیں لایا گیا۔ مجھے انتہائی "ڈرامائی انداز میں ۵ دسمبر" کو گرفتار کر لیا گیا۔ ایک ایسے انداز میں کہ میں اس کا ذکر کروں تو یور لارڈشپس کہیں گے کہ میں ریکارڈ شدہ کارروائی کے مطابق نہیں چل رہا۔ لیکن یہ ایک اہم حقیقت ہے کہ کس طرح کراچی میں مجھے گرفتار کیا گیا اور کس طرح میرے گھر کے اندر زبردستی گھسا گیا۔

میں چھپا ہوا نہیں تھا۔ نہ ہی اس کی توقع کی جا سکتی تھی۔ پچاس، ساٹھ کمانڈو اس انداز میں میرے کمرے میں گھس آئے کہ ان کے پاس سٹین گنیں تھیں۔ انہوں نے توڑ کر دروازے کھولے۔ میرے چھوٹے بیٹے کے سر پر چوٹ آئی۔ یہ سب حرکتیں قطعی غیر ضروری تھیں۔ میرے ملازموں کو زدوکوب کیا گیا۔ جبکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ دروازے کی گھنٹی بجائی جا سکتی تھی۔ میں باہر آ جاتا ...... وہ میری خواب گاہ میں میرے سر پر رائفلیں تان کر کھڑے ہوئے۔ میں نے ابھی سحری ختم کی تھی۔ میں سونے والا تھا۔

یہ سارا ڈرامہ پہلے سے تیار کیا گیا تھا۔ پھر مجھے لاہور لاکر کنٹونمنٹ کے ایک بنگلے میں رکھا گیا۔ ہر شخص یہ کہہ رہا تھا کہ میں ایف آئی اے کی نگرانی اور حراست میں ہوں ایف آئی اے والے میرے کیس کی تحقیقات کر رہے ہیں۔ بہرحال جب بھی دوبارہ ازسرِ نو تحقیقات کا مرحلہ آیا۔ ان نئی تحقیقات کا آغاز مجھ سے نہیں کیا گیا۔

اور پھر یہ بھی کہ یہ تحقیقات نہیں تھیں۔ بلکہ حراست میں لیا گیا تھا۔ مجھے حراست میں لے کر گرفتار کیا گیا تھا اور عبدالخالق نے مجھے دھمکی دی۔ مائی لارڈ، یور لارڈ شپس نے عنایت کی اور دوسرے دن اس پر اپنی رائے دے سکتے تھے کہ شہادت پر کوئی دباؤ نہ تھا۔ ادب و احترام سے عرض کرتا ہوں کہ اگر آپ یہ رائے دیتے کہ شہادت پر کوئی دباؤ نہیں۔ جبکہ وہاں گواہوں پر عدالت کی طرف سے شدید دباؤ ڈالا گیا تھا۔ جس کا ذکر میں نے خود ہائی کورٹ میں کیا تھا۔ جب عبدالخالق بھی وہاں موجود تھا۔ جب اس نے کہا کہ اس نے میاں عباس پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا۔ پہلے میں خاموش بیٹھا رہا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ عدالت کا فوری ردِعمل کیا ہو گا۔ لیکن جب وہ ایک بہت بڑا مومن۔ ایک مقدس آدمی (مائی لارڈ اس کی ڈاڑھی بھی تھی) بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ "میں ایسا کوئی کام کرنا پسند نہ کروں گا" تو میں اُٹھ کھڑا ہوا اور اس سے پوچھا "تم کیا باتیں کر رہے ہو، تم نے یہ گستاخی کی اور مجھے اس وقت دھمکی دی جب میں کنٹونمنٹ کے بنگلے میں تھا۔ اور جب تک میں نے تمہیں ڈانٹا نہیں تھا تم خاموش نہیں ہوتے تھے۔ تم تو مجھے دھمکی دے رہے تھے۔ پھر یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ تم نے ان لوگوں کو دھمکایا نہیں ہے۔

استغاثے کے گواہ نمبر ایک کی گواہی کو محرک کی شہادت بنایا گیا ہے۔ اس طرح استغاثے کے گواہ نمبر ۲ اور گواہ نمبر ۳ کی شہادتیں بھی اس سے معاون و متعلق دستاویزی شہادتوں سے مربوط کی گئی ہیں۔ جو استغاثے نے اس حوالے سے پیش کی ہیں۔ اس مقدمے میں جو تین افراد تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں ایک خود مستغیث ہے اور دو مسعود محمود اور سعید احمد ہیں اور نام نہاد دستاویزی ثبوت، جسے استغاثے کے گواہ نمبر ایک اور نمبر دو نے پیش کیا ہے۔ اور جہاں تک محرک کا تعلق ہے انہی پر بنیاد رکھی گئی ہے۔ مائی لارڈ، اب پیراگراف

نمبر ۲۵۴ ملاحظہ کیجئے ۔ پیراگراف نمبر ۲۵۴ پڑھے بغیر میں ایک مبتدی ہوں ۔ میں یکسر غلط کار ہوں پر لارڈشپس بہتر پوزیشن میں ہیں کہ وہ کوئی فیصلہ کر سکیں ۔ لیکن میرے خیال سے یہ سب کچھ افواہ اور سنی سنائی ہے ۔ پورا پیراگراف نمبر ۲۵۴ سنی سنائی افواہ ہے ۔

آنریبل چیف جسٹس :۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے احمد رضا قصوری کے بیان پر انحصار کیا ہے ۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو :۔ جی ہاں ۔ لیکن اس نے اپنی ذاتی معلومات پر انحصار نہیں کیا ۔ وہ فریق نہیں ہے ۔ وہ ان واقعات اور مناظر کا چشم دید گواہ ہی نہیں ہے ۔

ایک معزز جج :۔ صفائی نے اس سے اس نکتے پر سوالات کیے تھے اور اس نے کہا تھا وہاں ، یہ میری رائے پر استوار ہے ۔ یہ اس کا جواب ہے ۔ اس لیے آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں کہ یہ اس کی اپنی رائے تھی ۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو :۔ جی ہاں یہ اس کی اپنی رائے ہے ۔

ایک معزز جج :۔ اس کی رائے کسی لے ۔ والی زید کی رائے نہیں ہو سکتی ۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو :۔ ایک لمحے کے لیے میں 'ادھر سے ہم ادھر سے ہم' کو چھوڑ دیتا ہوں ۔ لاہور میں ۲۸ فروری کو ایک جلسہ ہوا ۔ مثال کے طور پر میں پیش کروں گا کہ اس نے یہ بتایا کہ میں نے کہا تھا ۔ "کہ میں ٹانگیں توڑ دوں گا ۔" ایک طرف کا کرایہ لے جائیں ۔ اگر جناب ایک طرف کا کرایہ ان کو ملتا ہے تو میں ان کی ٹانگیں کیسے توڑ سکتا ہوں ۔ وہ تو پھر وہاں ہوں گے ۔ وہ ڈھاکے میں بیٹھے ہیں ۔ میں یہاں سے ان کی ٹانگیں کیسے توڑ سکتا ہوں ۔" میں نے ایسی ہنسوڑ اور بے معنی باتیں نہیں کہیں ۔ دراصل یہ رجعت پسند ظلمت پسند ، عوام دشمن پریس نے ایسی باتیں اڑائی تھیں ۔ میرے بیانات اور تقریروں کو مسخ کرنے کی کوشش کی ۔ یہ تو سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ اگر وہ ایک طرف کی ٹکٹیں لے کر ڈھاکہ جاتے ہیں تو ان کی ٹانگیں کیسے توڑی جا سکتی ہیں ۔ جب وہ ایک طرف کی ٹکٹیں لے کر ڈھاکہ جاتے اور وہیں رہتے ہیں ؟

ایک آنریبل جج :۔ ہمیں بھی عدالت میں ایک ایسا تجربہ ہو چکا ہے ۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو :۔ ایک بہت بڑا بھارتی سمندر لاہور کو ڈھاکے سے جدا کرتا ہے

بھلا میں ان کی ٹانگیں لاہور میں رہتے کس طرح توڑ سکتا ہوں کہ جب وہ ڈھاکے میں یک طرفہ ٹکٹ کے ساتھ گئے ہوں۔ میں نے کہا تھا کہ ان کے پاس ایسی ٹانگیں ہی نہیں رہیں گی کہ وہ ان پر کھڑے ہو سکیں۔ میں نے اس قسم کی بات کہی تھی۔

"کس منہ کے ساتھ یا بات کریں گے ان کے ساتھ۔"

کیا آپ کو آگر کہیں گے بس ٹانگ پر کھڑے ہوں گے۔ کیسے آپ ذکر کریں گے۔

کیا کر کے آئے ہیں وہاں سے۔

وقت بچانے کے لیے جب میں اپنے برتاؤ کے واقعات کا ذکر کروں گا۔ اس لیے میں اس پر چند مشاہدات اور آرا ہی دوں گا۔ میں وقت بچاؤں گا۔

یہاں ایک فائل پر میرے دستخطوں کی یہ تشریح کی گئی ہے کہ میں نے وہ فائل دیکھی تھی یہی سب کچھ ہے۔ ایک دوسری جگہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ فائل پر دستخط یہ بتاتے ہیں کہ میں نے یہ فائل دیکھی ہے۔ جیسے کہ دستخط یہی ظاہر کرتے ہیں کہ یہ فائل دیکھی گئی ہے۔ اس کا گویا یہ مفہوم لیا گیا ہے کہ اگر کسی فائل پر محض میں نے دستخط کیے ہیں اور ان پر کوئی ریمارک نہیں دیا تو بھی میں نے اس فائل کو دیکھا ہے۔ جب میں اس نکتے پر آتا ہوں کہ شفیع الرحمان ٹربیونل نے جو بعض مشورے سعید احمد نے اشاعت کے لیے دیے تھے (وہ بیانات جنہیں اخبارات پہلے ہی چھاپ چکے ہیں) تو اس پر بھی میں نے دستخط کیے ہیں۔ مائی لارڈ۔ یہاں دو مختلف انداز میں تشریحات کی گئی ہیں۔ کہا گیا ہے کہ "وہ متفق ہو گیا ہے۔ پھر یہاں بھی وہی تشریح کیوں" نہیں کی جاتی کہ اس فائل کو بھی میں نے دیکھا ہے۔ لیکن اس مثال کا تعلق تو اس نتیجے سے ہے جو سامنے آنے والا ہے۔

پیراگراف نمبر ۴۶۴ - اس پر میں بھی رائے دوں گا جس میں سازش کے معاملے کا مسئلہ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ قومی اسمبلی میں ۳ جون ۱۹۷۴ء کو تو تکار اور جھگڑے کے بعد میں نے مسعود محمود کو ذمے دار قرار دیا کہ وہ اسے سزا دے۔ جبکہ اس سے پہلے میاں عباس کے نام بھی حکم جاری کیا جا چکا تھا۔ اس سے اس ارادے میں جو تضاد پایا جاتا ہے واضح ہے کہ تو تکار یا نظریات کے اختلاف کو اس کا محرک قرار دیا جائے۔ کہ میں ناراض اور مشتعل ہو گیا کر

کر میں نے اسے ختم کرنے کا ارادہ کر لیا۔ وہ یہاں کہتے ہیں کہ میں ۳ جون ۱۹۷۴ء سے پہلے یہ حکم میاں عباس کو دے چکا تھا۔ یوں اس کا محرک ۳ جون ۱۹۷۴ء کے بعد معرض وجود میں نہیں آیا۔ مائی لارڈ تو یہ ہے فیصلہ جو سازشش کے ساتھ تعلق کے بارے میں دیا گیا ہے۔

دوسرا نکتہ وہ ثبوت اور شہادت ہے جو پیراگراف ۴۰۴ میں شروع ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ احمد رضا قصوری کے شدید حملوں اور اعتراضات کے بعد استغاثہ کے گواہ نمبر ایک نے کہا اور بڑے ملزم اور اس کے ماننے والوں کا ردّ عمل یکساں تھا۔ جبکہ ایف آئی آر میں اس نے اس کا خود اندراج کیا ہے۔ اور مسٹر جسٹس وحید الدین نے فرمایا تھا کہ اس محرک اور وجہات کی دیگر وجوہات بھی ہو سکتی ہیں۔ لیکن آپ نے دیگر تمام دوسری وجوہات کو خارج کر دیا ہے۔ مسٹر جسٹس علیم نے پوچھا "کیا آپ نے دیگر تمام وجوہات کو خارج کر دیا ہے" مسٹر جسٹس وحید الدین نے جواب دیا، لیکن یہ صرف ایک وجہ ہو سکتی ہے۔ یہ سلسلہ یہیں تو ختم نہیں ہو جاتا۔"

اسلام آباد میں اس نے اپنی ایف آئی آر میں چار ممکنہ محرکات کا اندراج آغا صفدر سے کرایا۔ شفیع الرحمان ٹربیونل میں اس نے اپنی زہریلی تقریروں کا سبب بھی چار مکمنہ وجوہات بیان کی تھیں۔ پھر جب اس نے اسلام آباد کے حادثے کے بعد ایک تحریک استحقاق پیش کی تو اس نے اس میں کسی محرک کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن اسلام آباد میں یہ تحریک استحقاق ۳ جون ۱۹۷۴ء کے بعد پیش کی گئی۔ یہ ۳ جون کا اختتام تھا۔ ۱۰ نومبر اور ۳ جون کے درمیان بہت بڑا فاصلہ ہے۔ ۳ جون کے بعد تحریک استحقاق ۱۴ اگست کو پیش کی گئی۔ اس نے ایف آئی آر میں بھی کوئی محرک بیان نہیں کیا۔ جو بیان اس نے دفعہ ۱۶۱ کے تحت آغا صفدر کو دیا تھا اس میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے۔ آغا صفدر کا معاون تحقیقاتی افسر ناصر عدالت میں موجود تھا۔ لیکن اس سے یہ سوال پوچھنے کی اجازت نہ دی گئی۔ اس نے کہا کہ ایسے سوالوں کو اکثر دوسرے مقدموں میں بھی مسترد کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ ایسے سوالوں کے جوابات کی اجازت دی جاتی ہے۔ اور پھر یہ بھی کہ اس نے تحریک استحقاق میں اس کا کوئی ذکر نہ کیا تھا۔ دس جون کو جو ایف آئی آر درج کی گئی اسے بھی اسے حوالے سے دیکھا

جا سکتا ہے۔ یہ میں پیراگراف ۴۶۴ کے حوالے سے کہہ رہا ہوں۔

میں یور لارڈشپس کی توجہ پیراگراف نمبر ۳۶۶ ، ۳۶۷ ، ۳۶۸ ، ۳۶۹ ، ۳۷۰ ، ۳۷۱ ، ۳۷۲ ... یعنی ۳۶۶ سے ۳۷۲ پر دلانا چاہتا ہوں۔ شہادت ایکٹ کے سیکشن نمبر ۳۲ پر ایک اعتراض اٹھایا گیا تھا۔ اب میں یہ وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ سنی سنائی کے قواعد میں ایک استثنائی صورت بھی ہوتی ہے۔ اور باجوہ کی شہادت کو اسی استثنائی صورت میں ہی لینا چاہیئے یور لارڈشپس نے دو مواقع پر استثنا کا ذکر کیا ہے۔ (۱) جبکہ بیان عام روایتی انداز میں ایسے شخص نے دیا ہو۔ جو پیشہ ورانہ فرائض سے متعلق ہو یا پھر ایک ایسا شخص جسے اس کی ڈیوٹی سے ڈسچارج کیا جا چکا ہو۔ (۲) جبکہ یہ بیان اگر سچا ہو تو اسے مجرمانہ سزا کو ظاہر کرتا ہو۔ اب ان کی بنیادوں پر اور اتفاقیہ طور پر ان مقدموں میں یور لارڈشپس نے حوالہ دیا ہے۔ مثلاً شہناز بیگم کا کیس جو سندھ اور بلوچستان کے تمام ہائی کورٹ کے ججوں کے خلاف ہے۔ جس کی کھلی سماعت نہ کی گئی۔ حالانکہ وہ سندھ اور بلوچستان کی تمام ہائی کورٹوں کے تمام ججوں کے خلاف شکایت کر رہی تھی۔

بہرحال یہ ایک نکتے کے ایک طرف ہے۔ لیکن جو سوال بیان اٹھتا ہے کہ کہا گیا ہے کہ ۳۷۱ کے تحت ، باجوہ کے تمام غیر قانونی اعمال (وہ ایک ایسے نقطۂ نظر کو پیش کر رہا ہے جس کے تحت اصل ملزموں کو قانونی سزا سے بچایا جائے۔) اور دھمکیاں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ اسے زیر دفعہ ۴۰۶ اے سزا ملنی چاہیئے۔ اس نے جو مداخلت ہائے بے جا کیں۔ اس کے لیے بھی زیر دفعہ ۵۰۶ اس کے برتاؤ کو قابل مواخذہ قرار دیا جائے گا۔ اور پھر پیراگراف نمبر ۳۷۲ میں کہا گیا کہ باجوہ نے جو کام کیا اس کے تحت وہ جرم میں معاون بن جاتا ہے۔

اب میرا نکتہ یہ ہے کہ اگر باجوہ سعید احمد کا ایک ماتحت ہے۔ سعید احمد کے تابع کام کر رہا ہے۔ سعید احمد کا براہ راست ماتحت ہے اور براہ راست اس کی ہدایات کے مطابق کام کر رہا ہے ، اگر باجوہ اپنی ان تمام سرگرمیوں کا ذمے دار قرار دیا جائے جنہیں واقعات کے تحت دفعہ ۵۰۹ کے تحت قابل مواخذہ قرار دیا جاتا ہے۔ اور جرم میں مددگار بن جاتا ہے وہ جرم میں شریک اور ساتھی ہے تو پھر اس کی شہادت زیر دفعہ ۱۳۲۔ استثنا کے تحت

آئی ہے۔ مَیں یور لارڈشپس سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر اس کا اطلاق کہیں زیادہ شدت اور سختی سے سعید احمد پر ہی ہوتا ہے۔ جسے ایک آزاد گواہ کا درجہ دیا گیا ہے۔ اس لیے چونکہ سعید احمد اس کا افسرِ بالا ہے۔ اور باجوہ براہ راست اس کے ماتحت کام کر رہا ہے۔ تو پھر یہ طے شدہ ہے کہ وہ سعید احمد کی خواہشات اور ہدایات کے مطابق عمل کر رہا ہے۔ وہ اپنے طور کام نہیں کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ سعید احمد یہ کہہ چکا ہے کہ ۱۹۷۳ء میں فائلیں کھو چکی تھیں۔ پھر اس نے جون ۱۹۷۴ء میں اپنی فرضی اور خیالی گفتگو کا ذکر کیا ہے۔ جب مَیں نے اس کے ساتھ طویل گفتگو ختم کی اور اس سے پوچھا "کیا وہ احمد رضا قصوری کو جانتا ہے"

مائی لارڈ، چیف سکیورٹی افسر جو پولیس میں رہ چکا تھا۔ آئی جی پولیس، ایڈیشنل آئی جی ایک بہت پرانا آدمی، جسے یور لارڈشپس بجا طور پر گندہ انڈا کہہ سکتے ہیں۔ (لیکن بہت سے گندے انڈے آخری مہینوں میں راستے میں آ گئے تھے۔ مَیں نہیں جانتا کہ وہ کونسی مرغی ہے جو یہ گندے انڈے دیتی ہے۔ جو مَیں نے آخری اٹھارہ مہینوں میں دیکھے تھے) لیکن یہ گندہ انڈا، یہ ناک گھسیڑنے والا، جو دوسرے شعبوں کو سونگھتا پھرتا ہے۔ جو ہر چیز میں دخل دیتا تھا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ اور میں اسے بار بار تنبیہہ کرتا تھا کہ وہ خارجہ امور میں دخل نہ دے دوسرے شعبوں اور محکموں میں مداخلت نہ کرے۔ کیونکہ مجھے وزارت خارجہ سے شکایت موصول ہوئی تھی۔ صوبائی حکومت کے معاملوں میں مداخلت نہ کرو۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ احمد رضا قصوری کو نہیں جانتا تھا۔ جس کے بارے میں فرض کیا جاتا ہے کہ وہ میرا سیاسی حریف تھا۔ جو میرے لیے سب سے بڑی دھمکی سمجھا جاتا تھا۔ میرے چیف سکیورٹی افسر نے مجھے کہا "مَیں اسے نہیں جانتا۔" اس نے بڑی معصومیت سے کہا "میں ۱۹۷۴ء میں اسے نہیں جانتا تھا۔" لیکن اس نے دسمبر ۱۹۷۳ء میں اس کی فائل کھولی تھی۔ اور سعید احمد عام طور پر قومی اسمبلی جاتا تھا۔ لیکن وہ قومی اسمبلی کے ایک رکن کو نہیں جانتا تھا۔ جس نے ہائی کورٹ میں یہ بیان دیا کہ وہی احمد رضا قصوری اسمبلی میں شب و روز مجھ پر تنقید اور حملے کیا کرتا تھے۔ اور اسمبلی کے باہر بھی مجھ پر حملے کرتا تھا۔ لیکن اس مسٹر سعید احمد، چیف سکیورٹی افسر نے مجھے کہا کہ مَیں اسے نہیں جانتا۔ خیر ان لوگوں نے میرے ساتھ جو کچھ کیا وہ سب کے سامنے ہے۔

انہوں نے ہر شخص کو اس میں گھسیٹنے کی کوشش کی اور اپنے آپ کو باہر رکھنے کی کوشش کی۔
مسعود محمود کا کہنا ہے کہ وہ تقریباً ہر روز مجھ سے ملتا تھا۔ اس نے بتایا کہ جب میں ملتان گیا تو وہ اس وقت بھی ملتان میرے ساتھ تھا۔ میں کوئٹہ کے سفر میں ہوں تو وہ میرے ساتھ کوئٹے میں موجود تھا۔ میں جہاں جاتا وہ میرے ساتھ ہوتا۔ کیونکہ وہ ایف ایس ایف ہے اس لیے وہ ہر جگہ ہے۔ اس کا بیان ہے کہ اس کی مجھ تک رسائی تھی اور میرے پاس گرین ٹیلیفون تھا۔ میں گرین ٹیلی فون استعمال کرتا تھا۔" میں اس عنصر کا کیوں ذکر کر رہا ہوں۔ اس غیر ملکی عنصر کو، جسے خصوصی سرکاری وکیل مرحوم انور نے ایک "کلوز سرکٹ کرائم" قرار دیا تھا۔ یقیناً" یہ واقعی ایک کلوز سرکٹ کرائم تھا۔ اگر اس کی نوعیت بھی واقعتاً کلوز سرکٹ کرائم کی تھی اگر میں مجرم ہوتا تو پھر میں اپنے جرائم کو یوں محض پھیلاتا نہ پھرتا کہ "جاؤ میں نے اسے احمد رضا قصوری کے بارے میں ایک پیغام بھیجا تھا۔"

باجوہ جو پیراگراف نمبر ۵۰۹ میں ذمہ دار قرار دیا گیا۔ جسے جرم کا معاون اور مددگار قرار دیا گیا۔ جسے جرم میں ساتھ دینے کا مجرم سمجھا گیا۔ جسے قانون شہادت کے سیکشن ۳۲ کے تحت مستثنیٰ سمجھا گیا۔ اور انہی بنیادوں پر اسے مجرم قرار دیا گیا۔ لیکن اس کے افسر بالا اور آقا سعید احمد کو ایک آزاد گواہ کی حیثیت دی گئی۔ اس حقیقت سے قطع نظر اس نے ہی وہ نام نہاد فائل کھولی تھی۔ وہ پیغام پہنچاتا ہے۔ بلکہ وہ بہت شدت اور گہرائی سے تمام واقعات میں حقیقتاً ملوث ہے۔ اسے آزاد گواہ قرار دیا جاتا ہے۔ جی ہاں یہی کہا جاتا ہے۔ لیکن وہ کس طرح سے ایک آزاد گواہ ہے۔ اسے کس طرح استثنائی گواہ کی حیثیت دی جا سکتی ہے؟ وہ ایک آلودہ اور داغدار گواہ ہے۔ اور ایک گندے اور داغدار گواہ کو دوسرے داغدار گواہ کی جگہ تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ اگر باجوہ مجرم ہے، اگر وہ اس جرم میں شامل ہے تو پھر سعید احمد خان اس سے بھی بڑا مجرم ہے۔

میں ایک نام کا مسلمان ہوں۔ لیکن میلون روپرٹ ویلش ایک مسلمان ہے۔ ایک اچھا مسلمان ہے۔ میلون روپرٹ ویلش سر، اب آخر کار — خدا کے لیے نام تو بدلو۔ کہیں تو مسلمان کا نام لکھو۔ میلون روپرٹ ویلش خود کو لکھوا دو نہیں تو لکھوا دو۔

میلون روپرٹ ویلیش ایک مسلمان ہے۔ ایک بہت اچھا مسلمان ہے۔ اور اسے براہِ راست ایک اچھے مسلمان کی حیثیت سے قبول کر لیا جاتا ہے اور فیصلے میں بڑے پُر لطف انداز میں اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔ چار بار اس کا پورا نام اس میں استعمال کیا گیا ہے۔ میلون روپرٹ ویلیش۔ اگر یہ روپرٹ آف ہینیسا ہے یا کوئی میلون روپرٹ ویلیش ہیں تو مسرور ہوں کہ اس ڈرامے میں ایک ویلیش بھی شامل ہے۔ خدا جانتا ہے وہ اس مقدمے میں کہاں سے شامل ہو گیا۔ وہ مجرم بھی نہیں ہے اور مددگار مجرم بھی نہیں۔ وہ تو ایک اچھا عمدہ انسان ہے جو مسعود محمود کو بتاتا ہے کہ اسے مجرمانہ کارروائیاں کرنی پڑیں گی۔ کیونکہ اسے ڈر ہے کہ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو اسے حکومت دشمن سرگرمیوں کے الزام میں پکڑ لیا جائے گا۔

اگر یہاں کوئی جرم ہوا ہے تو پھر سعید احمد اصل سازشی ہے۔ اگر باجوہ سازشی ہے تو... لیکن میں بات آگے بڑھاتا ہوں۔ یور لارڈشپس میں صرف یہ نہیں کہتا کہ سعید احمد اور میلون روپرٹ ویلیش اور باجوہ اس درجہ بندی میں آتے ہیں۔ میں آپ کی توجہ اس بات پر مبذول کرانا چاہوں گا۔ جس کا تعلق اصغر خاں سے ہے جو پیراگراف نمبر ۲۲۲ میں ہے جس میں اصغر خاں وارث سے کہتا ہے کہ وہ سعید احمد سے اسلام آباد جا کر ملے۔ محمد وارث جسے ان کی تحقیقات کا انچارج بنایا گیا ہے۔

یہاں پر شہادتیں متضاد اور اختلافی ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ وہ سعید احمد کے آنے سے پہلے انچارج تھا۔ کوئی کہتا ہے کہ سعید احمد نے اسے انچارج بنایا۔ لیکن بہر حال یہ نکتہ نہیں ہے۔ پہلے تو اس اصغر خاں نے ہسپتال میں بڑے غصے اور طیش کا مظاہرہ کیا۔ اور پھر وہ پہلے حوالوں میں کہتا ہے "یہ ایک اندھے قتل کا کیس ہے۔ اس کی تحقیقات کیسے کی جا سکتی ہیں؟ پھر وہ بالکل ہی ڈھے جاتا ہے۔ وہ فوراً وارث سے کہتا ہے کہ تم اسلام آباد جاؤ۔ تمہیں سعید احمد خاں سے ملنا چاہیے۔ وہ تحقیقات کا انچارج ہے۔ تم جاؤ۔ وہ جرم میں ایک فریق بن جاتا ہے۔ اور وضاحت کرتا ہے کہ وہ کیوں نہیں جا رہا۔ لیکن دوسرے ہی پیراگراف میں وکیل خاں بھی ایک سازشی بن جاتا ہے۔ وہ بھی شریک جرم اور معاون جرم بن جاتا ہے۔

مائی لارڈز اب سوال یہ ہے کہ وہ سرکاری گواہ ہیں۔ اور سرکاری گواہوں کی شہادت ہمیشہ

داغدار ہوتی ہے۔ اسے مستند اور قابل اعتماد ہونا چاہیے۔ اور محض قابل اعتماد ہی نہیں ہونا چاہیے (اگر یہ قابل اعتماد اور مستند ہے) یہ مناسب حد تک مصدقہ بھی ہونی چاہیے۔ یہ دونوں سرکاری گواہ اس حد تک آگے جاتے ہیں کہ سیکشن نمبر ۱۰ کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ ہم پھر سعید احمد کی طرف آتے ہیں۔ ریکارڈ میں جو فضولیات اور تضادات موجود ہیں۔ ان سے قطع نظر سعید احمد یہ کہتا ہے کہ وہ تصدیق کرتا ہے۔ اس حوالے کی وجہ سے ....

"جو باجوہ نے فراہم کیا تھا۔ وہ باجوہ کا ماتحت نہیں ہے۔ وہ دونوں اکٹھے کام کرتے ہیں۔"

اب ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایک ماتحت جو کرے، جیسا کہ سرکاری وکیل نے کہا ہے تو پھر سازشیوں کو ایک دوسرے کے جاننے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ان دونوں میں اتفاق ہونا ضروری ہے۔ یہاں ایک ACTUS REUS ضرور ہوتا ہے۔ اگر یہ رضامندی اور اتفاق بذات خود ACTUS REUS ہو۔ پھر سازشیوں کے لیے ایک دوسرے کا جاننا ضروری نہیں ہوتا۔ کیونکہ اگر ایسا ہو تو پھر ٹیسٹ ان کے لیے مکمل ہوتا ہے۔ یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ سعید احمد بھی داغدار ہے۔ باجوہ کی طرح اور بلاشبہ میلون رو پرٹ ویلش بھی۔

پیراگراف نمبر ۳۸۵ پر میں ایک منٹ بات کروں گا۔ راجہ ناصر نواز کو گواہی کے لیے لایا گیا۔ لیکن یہ سوال نہیں کروں گا کہ آغا صفدر کو ثبوت دینے کے لیے کیوں نہیں کہا گیا اور خود آغا صفدر کو کیوں نہیں بلوایا گیا۔ ہم ان سب باتوں کا ذکر کر چکے ہیں۔ میرا نکتہ یہاں یہ ہے کہ میرے مطالعے کے مطابق ثبوت فراہم کرنے کا بوجھ میرے مقدمہ پر کیوں ڈال دیا گیا۔ اسے میری طرف کیوں منتقل کیا گیا؟ اس دستاویز کو استغاثے کے گواہ نمبر ۲۳ کے ذریعے ثابت کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کی تحریر کی شناخت ثابت کی جا چکی تھی۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس بیان کو پہلے ہی احمد رضا قصوری دے چکے تھے۔ یہ بڑے ملزم کے لیے لازمی قرار پایا کہ وہ قانون شہادت سے اسے ثابت کرے کہ یہ بیان استغاثے کے گواہ نمبر ۳ نے دیا تھا۔ اس کے آخر میں ایک جواب ریکارڈ میں تجویز کر دیا گیا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ گواہ نے اوریجنل دستاویز پیش نہیں کی تھی۔ تو

پیراگراف نمبر ۳۰۵ پر میری رائے یہ ہے مائی لارڈز!

اب میں ایک اہم معاملے کی طرف آتا ہوں۔ مائی لارڈز جو پیراگراف نمبر ۴۰۲ میں ہے۔ فاضل وکیل استغاثہ نے ایگزیبٹ نمبر D-۱۶/۳ کی شمولیت پر اس بنا پر اعتراض کیا کہ وہ فوٹو سٹیٹ کاپی ہے۔ یہ دستاویز اعتراض کے باوجود ثبوت کے لیے شامل کر لی گئی۔

یہ سعید احمد خان کی رپورٹ محررہ ۲۹-۷-۷۵ ہے کہ احمد رضا قصوری نے اس سے ملاقات کی۔ اور اس نے بڑے ملزم کے ساتھ ملاقات کی درخواست کی۔ اس پر میری انڈورسمنٹ یوں ہے "اسے مجھ سے دور رکھا جائے، اسے لازماً تلافی کرنی چاہیئے۔ مجھ سے ملاقات سے پہلے اسے جھکنا چاہیئے۔ وہ ایک گندہ کتا ہے۔ اس نے مجھے ایک پاگل آدمی کہا تھا۔ وہ اس حد تک بڑھ گیا کہ اس نے اپنے والد کے قتل کا الزام مجھ پر لگایا۔ وہ ایک چاٹنے والا ہے۔ وہ ناشکرا ہے۔ کچھ عرصے کے لیے اسے اس کی قسمت پر چھوڑ دیا جائے۔" اس کے بعد میری ایک اور انڈورسمنٹ بھی ہے۔ جو اسی تاریخ کو لکھی گئی۔ جس پر بڑے ملزم نے اپنے دستخط کیے۔ وہ یوں ہے ریلیز فائل اور اس میں پرائیویٹ سیکرٹری کو مخاطب کیا گیا ہے۔ فیصلے میں پیراگراف نمبر ۵۶۵ میں کہا گیا ہے کہ یہ جعل سازی ہے۔ اب میں اس دستاویز کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ میری دستاویز ہے۔

آنریبل چیف جسٹس:۔ ہاں ہاں .....

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو:۔ یہ ایک واحد یا ایسی فائل نہیں ہے جو پارٹی کے کسی آدمی کے بارے میں متعلقہ امور کے حوالے سے ہو۔ جب میں نے اس فائل پر ایک نوٹ سعید احمد خان کے لیے لکھا تو ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ فائل مجھے واپس بھیج دی جائے۔ جب میں نے ایک فائل جو قصوری کے متعلق بھیجی تو میں نے اس پر یہ نہیں لکھا تھا کہ "ایکشن لو" یا اس قسم کی کوئی بات، میں نے کہا تھا "اسے دیکھ کر مجھے واپس کر دو۔"

اب میں سوچتا ہوں کہ اس کے دو مقام ہیں۔ لیکن ایک مقام قطعی ہے۔ جہاں اس نے مجھے لکھا۔ جہاں میں نے اسے کہا کہ وہ اسے مجھے واپس کر دے۔ آخر یہ مجھے کیوں واپس کر دی جائے؟ اس لیے کہ شکایت کنندہ حکومت کے کسی عہدے پر نہیں تھا۔ وہ

ایک ایم این اے تھا۔ اور بہت سے ایم این اے تھے۔ وزیر نہیں تھا۔ اس لیے جہاں تک حکومت کا تعلق ہے اس کے ساتھ اس کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ لیکن جہاں تک پارٹی کا تعلق یا واسطہ تھا۔ یہی پہلی اور بڑی وجہ ہے جس کی بنا پر میں نے اس فائل کو کسی سرکاری افسر کے پاس نہیں بھیجا۔ میں نے اسے یہ فائل واپس کرنے کے لیے کہا تھا۔ اس ضمن میں میرے دوسرے خیالات بھی ہیں کہ میں نے آخر یہ فائل اسے کیوں بھیجی۔ کیونکہ یہ تو پارٹی کا معاملہ ہے۔ میں اس موضوع کو جانتا تھا۔ گزشتہ چھ سات ماہ سے سعید احمد اور باجوہ مجھے تنگ کر رہے تھے کہ قصوری پارٹی میں شامل ہونا چاہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کچھ دوسرے لوگ بھی ایسی ہی کوششیں کر رہے تھے۔ اس کی طرف سے کئی پیغام رساں اور مصالحت کرنے والے آ رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ وہ پارٹی میں دوبارہ شامل ہونا چاہتا ہے۔ اور یہ کہ آپس میں غلط فہمیاں ہو گئی ہیں۔

میں اس سلسلے میں سعید احمد یا باجوہ کو کوئی اشارہ دینا نہیں چاہتا تھا کہ میں اسے کچھ اہمیت دے رہا ہوں۔ عزت حیات خان اور دوسرے بھی بہت سے لوگ تھے۔ میں ان لوگوں کا نام کیوں لوں؟ بہت سے لوگ تھے۔ جنہیں وہ بھیج رہا تھا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اس نے ایک بار یہ بھی کہا تھا کہ وہ تحریک استقلال میں بھی رہتے ہوئے دراصل پاکستان پیپلز پارٹی کے لیے ہی کام کر رہا ہے۔ کیونکہ وہ اسے این ڈبلیو ایف پی میں شامل ہونے سے روک رہا ہے۔ یا پھر یو ڈی ایف میں۔ میں نے اس کی قابل تحسین خدمات کے سلسلے میں اسے شکریے کا پیغام بھجوایا۔ میں نے اسے یہ بھی کہلوا بھیجا کہ اگر وہ یو ڈی ایف میں شامل ہو جاتے ہیں تو اسے قطعاً محسوس نہ کروں گا۔

"یہ خالصتاً پارٹی کا ایک مسئلہ تھا۔ حتیٰ کہ میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ کیا اسے پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے سامنے رکھا جائے یا نہیں؟ کیونکہ سنٹرل کمیٹی میں اسے بے حد ناپسند کیا جاتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ غیر متوازن ہے۔ میں نے اسے پہلے ہی بہت سر چڑھا رکھا ہے اور میں ہمیشہ اس کا تحفظ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس لیے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ کہ کیا اس نوٹ کو میں اس آدمی سعید احمد کے پاس بھیجوں۔ یا نہ بھیجوں۔ کیونکہ

وہی ایک شخص ایسا نہیں تھا جس کا کوئی تعلق تھا۔ پھر یہ خالصتاً پارٹی کا ایک معاملہ تھا۔ میں یہ بھی فیصلہ نہ کر پا رہا تھا کہ اسے مرکزی کمیٹی میں پیش کروں یا نہ کروں۔ کیونکہ یہ مسئلہ اس سے پہلے وہاں اٹھایا جا چکا تھا۔ اور وہ اسے ہمیشہ مسترد کر دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اچھا ہوا کہ اس سے نجات مل گئی وغیرہ وغیرہ ...... اسی لیے یہی وجہ تھی کہ میں نے لکھا۔ "پلیز اسے فائل کر دیں"

کہا گیا ہے کہ سیاہی بدل گئی۔ مائی لارڈز میں نے کئی برس سے پین کا استعمال نہیں کیا۔ میں فیلٹ پین استعمال کرتا ہوں۔ دو یا تین ایسے فیلٹ پین میز پر پڑے رہتے تھے۔ میں انہیں اُٹھاتا اور استعمال کرنے لگتا۔ میری تمام فائلوں پر میری نوٹنگ آپ فیلٹ پینوں سے دیکھیں گے۔ آپ کوئی دوسری فائل بھی منگوا سکتے ہیں۔ تین یا چار سال پہلے یہ فیلٹ پین رائج ہوئے تھے۔ میں انہیں اپنے لیے زیادہ بہتر اور آسان سمجھتا تھا۔ جب یہ ختم ہو جاتے ہیں تو آپ انہیں پھینک سکتے ہیں۔ اس لیے تمام فائلیں اگر آپ انہیں طلب کریں، کسی استثنا کے باوجود آپ ان پر دیکھیں گے کہ میری نوٹنگ فیلٹ پین سے کی گئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دو مختلف فیلٹ پین میز پر پڑے تھے۔ میں نے پہلے کو میز پر رکھ دیا ہوگا۔ یہ سوچتے ہوئے کہ یہ فائل سعید احمد خاں کو بھیج دی جائے گی اور پھر دوسرا فیلٹ پین "پلیز اسے فائل کریں" لکھنے کے لیے استعمال کیا۔ میں ایک پین بھی تو استعمال کر سکتا تھا۔ مجھے اس کی خبر اس وقت ہوئی جب کہا گیا کہ سیاہی میں تبدیل کی گئی ہے۔ لیکن پھر بھی آپ یہ معائنہ کیوں نہیں کروا لیتے کہ کیا سیاہی کو مٹایا یا کھرچا گیا ہے؟

نہیں مائی لارڈز، نکتہ یہ ہے کہ اگر میں کوئی عذر تراشنا چاہتا، اگر میں چاہتا کہ میری زندگی اس ایک دستاویز پر منحصر ہے، اگر میرا ذہن مجرمانہ ہوتا تو یقیناً میں اپنے دفاع کا پورا زور صرف ایک سیاہ دستاویز پر صرف نہ کرتا اور پھر میں اس پر بہت موزوں اور شائستہ الفاظ لکھتا یہ تو بلا ارادہ بے اختیار لکھے گئے۔ میں اس میں ایسے الفاظ کبھی نہیں لکھتا اگر مجھے انہیں اس معزز عدالت میں یا کسی بھی عدالت میں پیش کرنا ہوتا۔ میں بہتر زبان استعمال کرنے کی کوشش کرتا۔ کیونکہ مجھے اس کا خیال ہی نہیں تھا کہ اس دستاویز کی کبھی ضرورت بھی پڑے گی یا کسی عدالت میں اس کی ضرورت محسوس کی جائے گی۔ جو الفاظ میں نے بے اختیار بلا ارادہ

لکھے۔ ان سے ہی آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میں نے اس سلسلے میں کسی ایک تنکے کا سہارا بھی لینے کی کوشش نہیں کی۔ کیونکہ میرا ذہن مجرمانہ نہیں ہے۔ یہی میری زندگی کی قیمتی متاع ہے کہ میں ایسا نہیں ہوں۔ اور پھر یہ کہ یہ دستاویز اوریجنل نہیں ہے۔ پھر میں نے اوریجنل دستاویز کیوں نہ رکھی؟ میں نہیں جانتا شاید میں اسے پارٹی کے سیکرٹریٹ بھیج دیتا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ اس مقدمے میں ان چیزوں کو بھی اہمیت دی جا رہی ہے۔ اس وقت اس معاملے کا تعلق اعلیٰ ترین اصولوں یا ریاست کے مفاد کے ساتھ قطعاً نہیں تھا۔

آنریبل چیف جسٹس:۔ پھر بھی کیا آپ یاد کر سکتے ہیں کہ یہ فوٹو سٹیٹ کاپی کہاں سے آئی؟

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو: فوٹو سٹیٹ کاپیاں رکھی جاتی تھیں۔ کیونکہ یہ حکومت کا نہیں بلکہ پارٹی کا معاملہ تھا۔ مکمل طور پر پارٹی کا معاملہ تھا۔ کہ کیا وہ پارٹی میں دوبارہ شامل کیا جائے یا نہیں؟ یہ ایک ایسا نکتہ ہے جس کا سرکاری سیکرٹ ایکٹ سے کوئی تعلق نہیں۔

آنریبل چیف جسٹس:۔ نہیں نہیں۔ مسٹر یحییٰ بختیار اس سوال پر بہت تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو:۔ اغلباً میں نے اسے پارٹی سیکرٹریٹ میں بھجوا دیا تھا۔ لیکن میں پورے وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ میں نوے فیصدی یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے پارٹی کے دفتر بھجوا دیا تھا۔

آنریبل چیف جسٹس:۔ تو پھر یہ فوٹو سٹیٹ کاپی کیا پارٹی کے دفتر سے لائی گئی ہے۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو:۔ ہاں ہاں۔ میں انہیں پارٹی کے دفتر بھجوا دیا کرتا تھا۔ کیونکہ یہ جماعت ایک قومی پارٹی تھی۔ یہ صرف اس لیے نہیں کہ صوبوں کو مطلع اور باخبر رکھا جاتا تھا۔ بلکہ صوبائی سربراہوں کو بھی باخبر رکھا جاتا تھا۔ کیونکہ جن کا ان امور سے تعلق ہوتا تھا۔ انہیں باخبر رکھا جاتا تھا۔ یور لارڈشپس نے پوچھا ہے کہ مسٹر پیرزادہ اور سپیکر اور پنجاب کے ایک اور وزیر معراج خالد کو انڈورسمنٹ کیوں دی گئی۔ اس کا جواب بہت سادہ ہے۔ شیخ رشید عمومی طور پر اصطلاحاً پارٹی کے ان امور اور جلسوں کے انچارج تھے۔ جو سرکاری نوعیت کے ہوتے تھے۔ معراج خالد اور پیرزادہ کو یہ ذمے داری سونپی گئی تھی کہ اگر ارکان

کسی مسائل کی وجہ سے پریشان ہوں تو وہ خوش رہیں اور تسلی بخش رویہ اختیار کریں۔ اس لیے ان سے رابطہ رکھا جاتا ہے۔ اور پھر اسی لحاظ سے میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں یہ جانتا کہ یہ دستاویز میری زندگی کو تحفظ فراہم کر سکتی ہے۔ میری زندگی بچا سکتی ہے اور اس پر ہر چیز کا انحصار ہو گا یا اس سے ہر چیز تباہ ہو جائے گی۔ تو پھر یہ دستاویز نہ تو اس صورت میں ہوتی نہ اس ہیئت میں اور پھر اس میں ایسے الفاظ بھی درج نہ ہوتے۔ اور میں خود ہی اسے اپنے پاس رکھتا۔

ایک معزز جج:۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی وزیر اعظم کے لیے ایسی دستاویز کا ظاہر ہو جانا بہت پریشان کن ثابت ہوگا۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو:۔ جی ہاں، بالکل۔

ایک معزز جج:۔ لیکن یہ زبان بذات خود گھناؤنے پن کا اظہار کر دے گی۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو:۔ ہاں ہاں۔ بے شک اس میں بہت کھردری زبان استعمال کی گئی ہے۔ بہت سخت زبان کا استعمال کیا گیا ہے۔ کیوں نہیں؟ آخر ہم ہی زبان کا استعمال کرتے ہیں اور جناب میں نے اسے استعمال کیا تھا۔

یہ پہلا نکتہ تھا، میرا دوسرا نکتہ یہ ہے کہ میرے بارے میں کہا گیا ہے کہ میں ان دستاویزات کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اب یہاں بھی میں بہت اختصار سے کام لوں گا۔ حکومت کا تختہ رات ڈیڑھ دو بجے الٹایا گیا یا اس کے قریب، ممتاز علی بھٹو اور پیرزادہ میرے پاس تھے جب وہ گئے، تو میں اپنے کمرے میں گیا۔ ابھی میں نے بتی بجھائی ہی تھی کہ میرے دو ملازم جو لاڑکانہ کے ہیں میرے پاس آئے اور انہوں نے بتایا ________

میں نے بتی جلائی، اور میں نے کہا "کیا ہوا" انہوں نے جواب دیا ________

اور جب میں نے پردہ ہٹایا تو وہ تمام جگہوں پر منڈلا رہے تھے۔ آخر رات کے دو بجے جب سب کچھ بند تھا اور پھر میرے پاس سیف بھی نہیں اور میں ایسی دستاویزات اپنے پاس بھی نہیں رکھتا۔ گھر میں کوئی نہیں ہے۔ تب ڈھائی بجے یا پونے تین بجے ٹیلی فون پر میری اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی گفتگو ہوتی ہے۔ انہوں نے بڑی عنایت کی۔ میری

بہت سی تعریفوں کے بعد اس نے کہا کہ تین مہینے کے اندر اندر ہیں پھر آپ کو سلیوٹ کر رہا ہوں گا۔ اس کے بعد مجھے کہا "اگر آج رات ہم آپ کے لیے کچھ بے آرامی پیدا کریں تو کیا آپ بُرا تو نہیں منائیں گے۔ کل ہم آپ کو مری کے گورنمنٹ ہاؤس بھیج رہے ہیں۔" "کل" کا دن طلوع ہو چکا تھا۔ اس لیے میں ہنسنے لگا۔ اسے بتایا۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ہم پہلے ہی کل میں داخل ہو چکے ہیں۔" اور پھر دوسرے یہ کہ میرے چاروں بچے آج ہی آئے ہیں ان میں سے ایک، ایک دن پہلے آیا تھا) کیا میں چند گھنٹے ان کے ساتھ گزار سکتا ہوں۔ میں نے ایسا نہیں کہا تھا "نہیں میں جانا نہیں چاہتا" میں نے کہا تھا "اگر آپ چاہتے ہیں تو میں ابھی کسی جگہ بھی جانے کے لیے تیار ہوں۔ جہاں آپ مجھے لے جانا چاہتے ہیں۔"

میں انقلابی انصاف کو ترجیح دیتا ہوں۔ میری خواہش تھی کہ وہ انقلابی انصاف کو اپناتے تو وہ بہت زیادہ بہتر ہوتا۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اور اب مسئلہ یہ ہے کہ میں نے بالکل نہیں کہا تھا کہ میں ٹھہرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا تھا کہ اگر آپ مجھے لے جانا چاہتے ہیں تو آپ ایسا کر سکتے ہیں۔ لیکن صورت حال یہ ہے۔ انہوں نے جواب دیا۔ "نہیں نہیں آپ ٹھہر سکتے ہیں۔" اب اس صورت حال میں میں نے اپنے بچوں کو بلوایا۔ ان میں کوئی ایک مہمان خانے میں تھا، جو تھوڑی دیر پہلے آیا تھا۔ میں ان کے ساتھ ایک یا دو گھنٹے رہا۔

اس کے بعد میں نے بعض فائلیں نمٹائیں۔ یہ پچیس کے قریب فائلیں ہیں۔ کیونکہ میرا ہمیشہ سے یہ اصول رہا ہے کہ اگلی صبح ہونے سے پہلے تمام کام نمٹا دیا جائے۔ ساری زندگی میرا یہی وطیرہ رہا ہے۔ صرف ایک ایسی فائل تھی جسے میں نمٹا نہیں سکا۔ جو مجھے موت دلوا سکتی تھی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ اکیلی فائل تھی جس پر میں نے دستخط نہیں کیے۔ لیکن میرے سارے کیریئر میں، بطور وزیر خارجہ، صدر اور وزیر اعظم، آٹھ برسوں تک میں نے کوئی فائل دوسرے دن کے لیے اپنی میز پر نہیں رکھی۔ تا آنکہ اسے کسی دوسرے وزیر کو بھیجا جانا ہو۔ میں نے ایسا کبھی نہیں کیا کہ کام ادھورا چھوڑوں۔ کام ختم کرنے کے بعد میں سوتا ہوں۔ بہر حال میں فائلوں پر کام کرتا رہا۔ اس کے بعد میں نے ناشتہ یا لنچ کیا۔ کچھ لوگ مجھے ملنے کے لیے آئے۔ میرا ملٹری سیکرٹری ملنے آیا۔ کچھ اور لوگ ملنے آئے۔ میرے اے۔ ڈی۔ سی جہاں

آئے۔ پیرزادہ کی بیٹی فون کر رہی تھی۔ میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ اس وقت جبکہ یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ میں پاکستان کے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

یہ ایک واحد ایسی دستاویز تھی جس کے بارے میں میں سارا وقت سوچتا رہا۔ دوسری کوئی دستاویز نہیں تھی جس کے بارے میں میں نے سوچا ہو۔ یہ دستاویز میرے ذہن پر مسلّط تھی۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ آنے والے دنوں میں کیا ہونے والا ہے اور میرا پورا ذہن اسی سے ہی بھرا ہوا تھا۔ میرا اسٹاف کہاں تھا؟ ان میں سے بہت سے ہل گئے تھے۔ خوفزدہ ہو چکے تھے۔

"وہ جہاں جاتے تھے۔ پولیس اور فوج ان کے ساتھ جاتی تھی۔ حتیٰ کہ وہ باتھ روم جاتے تو وہ بھی ان کے پیچھے ہوتے۔ ایسے لمحوں میں بھلا کون اس تاریک دستاویز کو اچانک تلاش کر سکتا تھا۔ اور پھر یہ کہ خود وائٹ پیپرز میں کہا گیا ہے کہ مسٹر بھٹو کو اپنے بے خطا اور ناگزیر اور ابدی ہونے کا اس حد تک یقین تھا کہ وہ تمام دستاویزات جوں کی توں محفوظ حالت میں چھوڑ گئے۔ وہ انہیں آنے والی نسلوں اور تاریخ کے لیے چھوڑ گئے تھے۔ یہ وائٹ پیپر میں کہا گیا ہے اور وائٹ پیپر ایک سرکاری دستاویزات ہے۔ جس کے جواب میں میں نے کہا تھا کہ میرے پاس چھپانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔

لیکن اگر میں کاغذات اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تو وہ کاغذات ساتھ لے جاتا جن کا تعلق انتخابات سے تھا۔ کیونکہ یہ بات میرے دماغ میں رہی تھی کہ انتخابات کے بارے میں حیلہ جوئی کی جائے گی۔ اگر کوئی ردوار کیا گیا تو وہ اس بہانے سے کیا جائے گا۔ یہی بات میں نے اپنے جواب دعوے میں کہی تھی۔ اور اسی بات پر مائی لارڈز آپ اس کی کیوں اجازت نہیں دیتے کہ اسے شائع کیا جا سکے۔ مجھے بہت برا کہا اور مطعون کیا گیا۔ کلنک کا ٹیکہ لگایا گیا اور یہ ایک سچی مصدقہ دستاویز ہے اس میں اس مقدمے کا ذکر ہے۔ اس میں این ایس ایف کا ذکر ہے۔ اب اسے دن کی روشنی میں کیوں نہیں لایا جاتا۔ میں آپ سے درخواست کروں گا کہ اس پر ہمدردانہ غور کیا جائے۔

آنریبل چیف جسٹس:۔ مسٹر بھٹو اگر اسے براہِ راست ہمارے سامنے لایا جاتا تو پھر

صورت حال مختلف ہوتی۔ لیکن جب یہ مجھ تک پہنچی تو آٹھ ججوں کے لیے اس کی ایک ہزار کاپیاں شائع کی گئیں تو حالات ایسے تھے۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو:۔ آپ مجھے جانتے ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص کی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں۔ وہ الفاظ جو کسی کی زندگی کے آخری وقت میں کہے جائیں انہیں کوئی نہیں بھول سکتا۔ اس کا یہاں یوں ذکر کیا گیا ہے جیسے وہ سمگل ہو کر پہنچی تھی۔ مائی لارڈز۔ ایک بار پھر ذلت اور رسوائی۔ میں یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں نے یہ بات کبھی نہیں چھپائی کہ میں اسے لکھ رہا تھا۔ رمضان کے پورے مہینے میں میں اس دستاویز کو انتہائی دشوار حالت میں لکھتا رہا۔ وائٹ پیپر میرے سامنے رکھا رہتا۔ گارڈ میرے چاروں طرف ہوتے۔ یہ بات میں سپریم کورٹ میں اپنے جواب دعوے میں بھی کہہ چکا ہوں۔ میں ابتدا سے اب تک پورے یقین سے یہ کہتا ہوں کہ یہ ایک مصدقہ اور مستند دستاویز ہے۔ میں محبت کا کوئی خط کسی کے نام سمگل کرنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ میں اسے قطعاً سمگل نہیں کر رہا تھا۔ اکیلا ۔۔۔

آنریبل چیف جسٹس:۔ تو پھر اسے کہاں روانہ کیا گیا تھا۔؟

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو:۔ میں ابھی یہی بتا رہا تھا۔ نکتہ یہ ہے، مسئلہ یہ ہے اور میں خوش ہوں کہ ایک سمگل شدہ دستاویز ہے۔ میں بطور خاص ایسی جزئیات پر غور و فکر کرنے کا عادی ہوں کیونکہ میں کوئی سستا انسان بننا پسند نہیں کرتا کہ میں اس دستاویز کو سمگل کروں جب میری بیوی اور بچے مجھے ملنے آتے تھے تو میں کبھی نہیں چاہتا تھا کہ ان کی تلاشی لی جائے۔ میرے نزدیک یہ انتہائی بے عزتی کی بات ہوتی اگر ان کی تلاشی لی جاتی۔ ہمارا اپنا ضابطہ اخلاق ہے جو بہت پرانا ہے۔ ایک بات مسٹر غلام مصطفےٰ جتوئی نے دعوےٰ کیا کہ ان کے گھر کی تلاشی لی گئی تھی۔ میں نے اپنے خاندان کے تمام افراد کو ساتھ لیا جسے سندھی رسم کے مطابق میاری کہا جاتا ہے اور ہم سب نے ان سے معذرت کی۔ تب میں پاکستان کا صدر تھا۔ میں اپنے پورے خاندان بچوں اور دونوں بیویوں کے ساتھ صدر پاکستان کی حیثیت سے ان کے گھر گیا تاکہ ان کی تلافی کر سکوں۔ کیونکہ ہمارے نزدیک یہ انتہائی توہین آمیز سمجھا جاتا ہے کہ کسی کی تلاشی لی جائے کیا میں کوئی چیز سمگل کروں گا۔ وہ جھوٹے تھے۔ ان لوگوں پر اپنے جھوٹ کا پول ان تمام

لوگوں کے سامنے کھل گیا تھا جو ہر وقت میری نگرانی کرتے تھے۔ میں نے کبھی کسی چیز کو اس طرح چھپانا نہیں چاہا اور پھر یہ کوئی چھپانے والی چیز بھی نہیں تھی۔ یہ آٹھ ججوں کے لیے نقول تیار کرنے کے لیے باہر بھیجی جا رہی تھیں۔ لوگ اس کے بارے میں غیر معمولی اشتیاق رکھتے تھے۔ پارٹی کے کارکنوں میں بڑا جنون تھا۔ وہ پارٹی کے بہت وفادار کارکن تھے۔ ان میں سے ایک نے یا چند افراد نے جسے یہ کام سونپا گیا تھا کہ وہ اس کی نقول تیار کرائے یا عدالت میں جمع کروائے کسی ایک نے اسے افشا کر دیا۔ ذرا اندازہ کیجیے کہ اس وقت آٹھ افراد نے خود سوزی کی تھی۔ اور یہ کوئی مذاق نہیں ہے۔ اور آپ انکے جذبات کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جب کوئی شخص بسیار کوشش کے باوجود اپنی انگلی تک جھلسانا پسند نہیں کرتا، وہ جل کر مر گئے۔

اور پھر مائی لارڈز یہ درست ہے کہ وہ دستاویز سب سے پہلے معزز عدالت کے سامنے پیش کی جانی چاہیے تھی۔ لیکن یہ طریقہ کار حال ہی میں رائج کیا گیا ہے۔ جب مسٹر بروہی نے بیگم نصرت بھٹو کیس میں میرے خلاف اپنا بیان حلفی سپریم کورٹ میں داخل کرایا تو اس سے پہلے انہوں نے یہ بیان حلفی پریس کے لیے جاری کر دیا۔ نہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ انہوں نے انتہائی تفاخر کے ساتھ پوری دستاویز پہلے پریس کو جاری کی تھی۔ سندھ ہائی کورٹ میں میں نے محدود عرصہ تک پریکٹس کی۔ اس میں بھی میں نے دیکھا کہ ایسا کیا گیا تھا۔ تمیز الدین خان کیس اور دوسرے کیسوں میں بھی ایسا کیا گیا تھا۔

اس لیے یہ کوئی بدنیتی کا کام نہیں تھا جو ہم کر رہے تھے جو غیر قانونی یا غلط تھا۔ یہ مروجہ عمل تھا۔ تاہم آپ نے جو نکتہ پیش کیا ہے۔ ہمیں اسے بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ میں ایسے کئی نکات تسلیم کر چکا ہوں۔ مائی لارڈز ہائی کورٹ میں میری نظر بندی کے مقدمے میں مسٹر جسٹس چوہان نے جو کہا وہ آپ کو یاد ہو گا انہوں نے کہا تھا کہ ان کی عدالت میں سو صفحات پر مشتمل ایک بیان حلفی داخل کیا گیا ہے۔ جس میں مجھ پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ میں پاکستان کی سلامتی کے خلاف کام کر رہا ہوں۔ مائی لارڈز مسٹر جسٹس چوہان نے یہ کہا تھا کہ یہ بات باہر نہیں نکلنی چاہیے۔ میں نے اسے تسلیم کیا اور اسے باہر نہیں نکلنے دیا۔ لیکن یہ دستاویز اس مقدمے کے ساتھ بہت گہری مطابقت رکھتی ہے۔ اس لیے اگر آپ اپنے اچھے موڈ میں اسے جاری کر دیں

تو میں بے حد شکر گزار ہوں گا۔

آنریبل چیف جسٹس:۔ نہیں نہیں۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو:۔ کیا ہم تھوڑے عرصے کے لیے کارروائی ملتوی کر سکتے ہیں۔

آنریبل چیف جسٹس:۔ اگر آپ بیان جاری رکھنے پر آمادہ نہیں تو ہم ساڑھے گیارہ بجے تک سماعت ملتوی کر دیتے ہیں۔

تھوڑے وقفہ کے بعد عدالت کا اجلاس دوبارہ شروع ہوا۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو:۔ باجوہ سے تعلقات رکھنے والا ایک چھوٹا سا نکتہ میں بیان نہیں کر سکا۔ اگر باجوہ داغدار ہے تو سعید احمد خان اس سے بھی زیادہ داغدار ہے۔ اس حیثیت سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ایجنٹ داغدار ہے اور اس کا بڑا افسر داغدار نہیں تو اس کا اطلاق مجھ پر کیسے کیا جا سکتا ہے۔ معاملہ یہ ہے کہ جب اس کا بڑا افسر داغدار ہے تو اس وجہ سے وہ ماتحت بھی داغدار ہے۔ لیکن یہاں ایک معکوس معیار کا اطلاق کیا گیا ہے۔

مائی لارڈز:۔ اب میں چاہوں گا کہ آپ ازراہ عنایت پیراگراف نمبر ۵۱۳ اور ۵۱۴ کی طرف آئیں۔ جو تحاریک استحقاق کے بارے میں ہے ان میں سے ایک تحریک استحقاق نمبر ۲۵ ہے۔ جسے قصوری نے ۲۹ نومبر کو داخل کیا تھا۔ جس میں اس نے کہا تھا کہ پیپلز پارٹی کے کارکن اس پر حملے کر رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یور لارڈشپس یہ دریافت کرنے کے قابل ہو جائیں گے کہ وہ اصل وجہ کیا ہے جس کی بنا پر مجھے نشانہ بنایا جا رہا ہے اور بار بار کہا جا رہا ہے کہ مسٹر بھٹو کے ایما پر وزیر اعظم کے ایما پر سب کچھ کیا گیا اور اس سلسلے میں کوئی مواد کوئی شہادت پیش نہیں کی جاتی۔ اور یوں صرف ایک سیاست دان کو اس کے ساتھ منسلک کیا جا رہا ہے۔ کہا جاتا ہے۔ مجھ سے استعفیٰ لے لیا جائے مجھے مستعفی ہو جانا چاہیے۔ اس سے ان کا مقصد یہ تاثر دینا ہے کہ میں ایسا کرنے کی اہلیت رکھتا ہوں جبکہ اصل حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اور اگر ایک بات کو مجھ سے منسلک کیا جاتا ہے تو پھر دسمبر ۱۹۷۱ء سے ہر غیر ضروری چیز کا تعلق میرے ساتھ قائم کیا جا سکتا ہے۔

جناب والا:۔ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کروں گا کہ میں ہمیشہ اس کا تحفظ کرتا

رہا اور یہ کہ اس میں ستم ظریفی یہ ہے کہ اس نے ساری بساط مجھ پر الٹ دی۔ میں نے یہ کوشش کی کہ لوگ اس کے نزدیک نہ جائیں کیونکہ اس کا مزاج ہی ایسا ہے کہ لوگ اس پر شدید اعتراض کرتے ہیں۔ میں نے ہمیشہ اسے سمجھانے کی کوشش کی اور اس کا خیال رکھا۔ اب یہ ستم ظریفی کہ اس نے یہی ساری باتیں میرے خلاف استعمال کی ہیں۔ جبکہ اصل وجہ یہ ہے کہ وہ کوئی عہدہ چاہتا تھا وزیر بننا چاہتا تھا۔ حتیٰ کہ وہ وزیر مملکت بننے کے لیے بھی تیار تھا۔ وہ کہتا کہ تم مجھے کیوں نہیں دیتے۔؟ میں ایک طویل عرصے سے آپ کے ساتھ چلا آرہا ہوں۔ میں جواب دیتا تم اس کے قابل نہیں اور جب اسے یہ یقین ہوگیا کہ اس کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ عہدہ حاصل کرسکے تو اس نے مختلف النوع طریقوں سے بلیک میلنگ شروع کردی ایک فارورڈ گروپ بنالیا۔ کیسا فارورڈ گروپ۔ رضا گروپ۔ چند اخباروں میں اس کا ذکر آیا ہوگا۔ جناب والا کیا آپ کو آج یاد ہے کہ رضا گروپ کیا تھا اور فارورڈ بلاک کے ارکان کون تھے۔

جناب والا!۔ پیراگراف نمبر ۵۶۹ سے ۵۰۹ تک وکیل صفائی "قربان صادق نے اپنے مؤکل کا بہت مؤثر دفاع کیا۔ یہاں وکیل صفائی اپنے مؤکل کا دفاع کررہے ہیں لیکن یہاں مقدمات کا انبار لگادیا گیا ہے۔ فرض کرلیا گیا ہے کہ میاں عباس مجھ سے ہدایات لیا کرتے تھے۔ جیسے وہ اس ڈرامے کے مرکزی کردار ہیں۔ پھر یہاں یہ مسئلہ بھی کھڑا ہے کہ آخر اس واردات کا محرک کیا تھا کیا سازش کی گئی تھی۔ اس وقت جب میاں عباس عدالت میں اپنے مقدمے میں دلائل دے رہے تھے اور بہت موثر انداز تھا تو انہوں نے کہا کہ مسٹر بھٹو اس کیس میں محرک نہیں تھے۔ اپنا دفاع کرتے ہوئے ان کے لیے یہ کم و بیش ناگزیر ہوگیا تھا کہ میری حیثیت کا بھی دفاع کریں۔ انہیں عدالت کی طرف سے کہا گیا اگر آپ بڑے ملزم کو اس واردات سے نکالنے کی کوشش کریں گے تو کیا آپ جانتے ہیں کہ اس کے نتائج آپ کے مؤکل کے لیے کیا ہوں گے؟

میں اس بدنیتی اور تعصب کے بارے میں ایک اور مثال پیش کروں گا یہ نہیں کہ نام کا مسلمان یا بڑا ملزم یا اس کے علاوہ جو کچھ کہا گیا بلکہ یہ کہ وکیل صفائی رکھا اپنے مؤکل کے حق میں دلائل دیتے ہوئے یہ دھمکی دی گئی کہ اگر تم نے اس مقدمے میں مسٹر بھٹو کے حق میں کوئی بات

لکی تو پھر سارا بوجھ آپ کے موکل کے سر آن پڑے گا۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ اپنے آپ پر قابو پائیں اور اسس نے کہا مسٹر قربان صادق کیا آپ اس کے نتائج سمجھ گئے ہیں۔ کیا آپ اس کی صفائی پیش کر رہے ہیں۔" اس کا دھیان رکھتے ہوئے محتاط ہو جائیں۔

پیراگراف نمبر ۹، ۵۰ میں مسٹر قربان صادق نے کہا ہے کہ اگر میں چاہتا کہ ایسا کام کروں تو خدا نے مجھے ایسی حیثیت اور طاقت دے رکھی تھی کہ میں اس کام کے لیے کسی کو لاڑکانے سے لا سکتا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ آخر لاڑکانہ سے ہی کیوں؟ ملک کے کسی بھی حصے سے ایسا آدمی میں حاصل کر سکتا تھا۔ اگر میں ایسا گندہ کام کرنا چاہتا تو مجھے ہر جگہ سے مدد مل سکتی تھی۔ اور اگر میں چاہتا کہ ایسا خوفناک کام کروں تو میں پھر قاتلانہ گھیراؤ کرتا۔ اس کے لیے میں ایسے لوگوں کو مامور نہ کرتا جو ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ جو لفظ "آغاز" سے ہی ہچکچا رہے تھے اور وہ ایف ایس ایف سے نہ ہوتے۔

جیسا میں نے کل کہا تھا کہ میں ایک بے جڑ منظہر نہیں ہوں۔ میری جڑیں اس سرزمین میں بہت گہری ہیں اور اسس ملک کے لوگوں کے ساتھ میری وابستگی بہت پختہ ہے۔ ایسی صورت میں بھلا میں مسعود محمود سے ہی کہتا کہ جو بہت اُلجھا ہوا، خوفزدہ اور ہراساں شخص ہے! ایسے کام کے لیے میں میاں عباس کے پاس ہی جاتا۔ جسے میں اپنی زندگی میں کبھی نہیں ملا۔ ۱۹۷۶ء سے پہلے میں اس کے نام سے بھی واقف نہ تھا کہ اس نام کا کوئی آدمی بھی ہے۔ اچھا، تو پھر غلام حسین جو انکار کرتا۔ غلام حسین جو اسس وقت سے ہی اپنے آپ کو باہر کھینچنے اور نکالنے میں لگا ہوا ہے۔ جب سے اس پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ وہ مضحکہ خیز آدمی۔ جو بعد میں لاہور چلا جاتا ہے۔ اور پھر اسلام آباد میں کیا محرک تھا کہ وہاں ناکامی ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ یور لارڈشپس میں سے ایک نے کہا ہے کہ اگر اسے کمانڈر بنایا جاتا تو وہ چوزہ ثابت ہوتا۔

ایک معزز جج:۔ نہیں۔ میں نے کہا تھا کہ مرغی کا دل رکھنے والا۔۔۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو:۔ ہاں تو وہ کسی طرح مرغی کا دل رکھنے والا بن جاتا۔ چودہ برس سے وہ کمانڈر ہے۔ پھر اس کا دل کس طرح مرغی کا بن جاتا اور اگر اس کا دل مرغی کا دل تھا تو اسے کہنا چاہیئے تھا کہ میرا دل تو مرغی کا دل ہے۔ اس لیے مجھے ایسا کام کرنے کے لیے نہ کہیں

لیکن نہیں اس پر شدومد سے زور دیا جا رہا ہے کہ تم لاہور جاؤ اور تم مجھے فون کرو۔ پھر میں تمہیں فون کروں گا۔

ان کے درمیان ایسے شبہات ہیں لیکن پھر بھی وہ ایک خوفناک گھناؤنا قتل کرنے کے لیے اپنے تمام تر شبہات کے جا رہا ہے۔ اور پھر یہ بھی کہ اسے اس پر ندامت بھی ہو رہی ہے۔ غلام حسین یہی بات کہتا ہے۔ ارشد اقبال بھی یہی بات کہتا ہے کہ انہیں ڈرایا اور دھمکایا گیا تھا۔ رانا افتخار بھی یہی بات کہتا ہے۔ غلام مصطفیٰ جتوئی بھی یہی بات کہتا ہے اور سبھی یہی بات کہتے ہیں۔

اور ملاحظہ کیجیے۔ اس میں کیا حسن ہے۔ حقائق سے ایک طرف، وہ سب کہتے ہیں کہ انہیں دھمکی دی گئی تھی۔ اب کچھ بھی ہو، بہرحال وزیر اعظم نامرد تو نہیں تھا۔ میرے پاس میرے اختیارات تھے۔ انتظامیہ کے باہر بھی۔ میرا بھرپور اثر و رسوخ تھا۔ تو پھر میں نے ایسے مرغی کا دل رکھنے والوں کا انتخاب کیا جو ہر لحظہ ہچکچا رہے تھے۔ اپنے پاؤں گھسیٹ رہے تھے اور جو کسی بوڑھے کے لیے افسوس کر رہے تھے۔ جو کسی ایسے شخص کے لیے نادم تھے جو خوب صورت تھا۔ اور جو کسی دوسرے کے لیے کسی دوسری وجہ سے افسوس کر رہے تھے۔

وہ فون کرتے ہیں۔ پھر تصدیق کرتے ہیں۔ تصدیق کرتے ہیں اور پھر دھمکی.... وہاں ایک بہتر ٹیم آپ کا انتظار کر رہی ہے۔ اور جناب اگر وہاں بہتر ٹیم منتظر ہے۔ تو پھر میں ایسی بہتر اور اعلیٰ ٹیم کو کیوں نہ چنتا۔ اور پھر آخر کار اگر مجھے ایف ایس ایف کو ہی چننا تھا جو میرے لیے بنائی گئی تھی کہ میں اس سے استفادہ کروں تو میں اس میں اضافہ کرتے ہوئے کہوں گا کہ آخر میں ہی کیوں؟ میرے لیے تو اس کی کوئی ضرورت نہیں اور پھر سوال یہ ہے کہ جب ایک برتر اور سپر ٹیم موجود تھی۔ تو پھر یہی لوگ کیوں چنے جاتے؟ جبکہ یہ بات بھی تو اہم ہے کہ سپر ٹیم نہ صرف اس کام کو انجام دیتی بلکہ ان لوگوں کا بھی صفایا کر دیتی۔

آنریبل چیف جسٹس: ہاں ہاں .... یہ تو ہے....

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو: اور پھر جیسے کہ گواہ غلام حسین نے کہا ہے کہ تین چار افراد پر مشتمل سپر ٹیم کو اس کام پر نہیں لگایا گیا۔ سوال یہ ہے کہ اگر کسی سپر ٹیم کا وجود تھا استغاثہ کو چاہیے تھا کہ

انہیں بھی گواہی کے لیے پیش کرتے۔ لیکن یہاں یہ تو موجود ہیں۔ لیکن سپریم دکھائی نہیں دے رہی وہ اسے صرف دکھا ہی نہیں رہے بلکہ اسے انہوں نے اپنے اوپر بٹھا رکھا ہے۔ نوٹ کیجیے۔ یہ سوال ہے۔ مجھے لاڑکانہ یا کسی دوسری جگہ جانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میں اپنے لوگوں کو جانتا ہوں۔ ایک مثال ہی لیجیے۔ کہ ایک عورت اپنے ہاتھوں پر مہندی لیے آئی۔ وہ مسکرا رہی تھی اس کے ساتھ اس کا اکیس برس کا جوان بیٹا تھا۔ وہ کہنے لگی "مبارک مبارک، مبارک" میں نے پوچھا۔ "کیسی مبارک مبارک" اس نے بتایا۔ "بدلہ لیا ہے۔ انتقام لیا ہے اپنے باپ کا۔ اتنا چھوٹا تھا۔ اور میں مٹھائی آپ کو دینے آئی ہوں۔ میں نے کہا کیا کہہ رہی ہو

میں نے کہا ایسا کام اس ملک میں نہیں ہونا چاہیے۔ میں تمہارے لیے کسی وکیل کا بندوبست کرتا ہوں۔ تمہارے خوبصورت اور جوان بیٹے کے لیے مجھے افسوس ہو رہا ہے۔ وہ کہنے لگی "وکیل کا بندوبست! نہیں ہم خوشیاں منانے والے ہیں اور آپ کو فخر ہونا چاہیے بھٹو صاحب کہ آپ کی کمان میں ایسے جوان ہیں۔

ہاں تو میری کمان میں ایسے لوگ تھے جو اپنے ہاتھوں پر مہندی لگاتے تھے اور اپنی آنکھوں میں سرمہ لگا کر کہتے تھے۔ ہم نے اسے ختم کرا دیا۔ میں ایسے لوگوں کے پاس بھلا کیوں جاتا اور ان سے کہتا کہ خدا کے واسطے یہ کام کر دو۔ ایسا گندہ کام کرو اور اس طرح کام یہ کر دو۔ میں قاتل نہیں ہوں۔ میں ہمیشہ ایسی چیزوں سے دور رہا ہوں۔ میں نے سرداری نظام کو انہی وجوہات کی بنا پر ختم کیا تھا۔ میں نے تمام بُرے کاموں کو ختم اور ان پر قابو پانے کی کوشش کی۔

اور اب میں فیصلے سے، یور لارڈ شپس کی مختصر توجہ دلانے کے لیے، (جسے میں پڑھوں گا بھی نہیں۔) پیراگراف نمبر ۱۰۵ کی طرف آتا ہوں جو جسٹس شفیع الرحمان کی رپورٹ میں ہے۔۔ میرا خیال ہے کہ جسٹس شفیع الرحمان نے اپنے ٹربیونل کی سماعت کا آغاز ۲۰ دسمبر ۱۹۷۴ء سے کیا۔ اور یہاں مائی لارڈز سعید احمد دعوے کرتا ہے کہ میں نے جنوری کے پہلے ہفتے میں اسے لاڑکانہ سے ٹیلی فون پر پوچھا۔ "تم کیا کر رہے ہو۔" جاؤ اور جا کر تحقیقات کا چارج سنبھال لو۔ ایک ماہ کے بعد بھلا مجھے کیا ہوا؟ ایک ماہ بعد جبکہ سب کچھ لاہور ہائی کورٹ کے سپرد ہو چکا تھا۔ میرا نام بُرے انداز میں لیا جا رہا تھا۔ ایک وزیر نے مجھے بتایا "آپ کا نام درج کرایا

گیا ہے۔ وہ اسے بلا وجہ کھینچ کر اس میں سے ایک سیاسی فٹ بال نکالنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ فکر مند نہیں ہیں۔" میں نے جواب دیا "ہاں، لیکن میں اس میں ملوث نہیں ہوں۔ تو پھر میں بھلا فکر مند کیوں ہوں گا۔ انہیں جو کرنا ہے کر دو۔

میں نے سعید احمد سے بالکل نہیں کہا تھا کہ" میں پریشان ہوں۔ میں اس سے تعلق رکھتا ہوں" وہ کہتا ہے کہ میں نے اسے ٹیلی فون کیا اور ایسا کہنا بے حد آسان ہے۔ اس نے کہا ہے کہ میں نے اسے گالی دی یا میں اس سے ٹیلی فون پر ناراض ہوا۔ میں نے سعید احمد کو ٹیلی فون ہی نہیں کیا۔ اس نے مجھے فون کیا ہوگا۔ اور پھر یہ حقیقت کہ وہ کہتا ہے کہ وہ راولپنڈی میں تھا اس سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ میں نے اسے ٹیلی فون نہیں کیا تھا۔ اگر میں نے اسے ٹیلی فون کیا ہوتا تو پھر اس کا ذکر نہ کیا جاتا کہ وہ کہاں ہے۔ کیوں کہ یہ شخص راولپنڈی میں تھا ہی نہیں۔ تب میرا اے ڈی سی مجھے بتاتا " سر وہ ملتان سے فون کر رہا ہے۔ وہ کراچی سے بول رہا ہے۔" میں نے اسے فون ہی نہیں کیا۔ اس نے مجھے فون کیا ہوگا۔ میں نے کیا ہوگا۔ جاؤ۔ دیکھو کیا ہو رہا ہے۔

اور آخر کیوں نہیں، آپ کو دیکھنا ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔ اس نے وارث کو چارج دے دیا۔ جس کے بارے میں فرض کر لیا گیا ہے کہ وہ ملازمت میں تھا۔ اور احد جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بہت ایماندار ڈی۔ ایس پی تھا۔ اس کے بعد وہ میرے پاس آتا اور بعض امور کے بارے میں رپورٹ کرتا ہے۔ جن کا ذکر کاغذات میں پہلے ہی ہو چکا ہے۔ یہ سب کچھ کاغذات میں آ چکا ہے۔ آخر یہ نوٹ اس میں کیا اہمیت رکھتا ہے کیا اضافہ کر سکتا ہے۔

اور اب ۶۲، ۷ چینی ہتھیار کے بارے میں ساری دنیا جانتی ہے کہ ہماری پاکستانی فوج چینی ہتھیار رکھتی ہے۔ ہماری سول آرمڈ فورسز کے پاس چینی ہتھیار ہیں۔ ایمونیشن بھی ہے ایف ایس ایف اور ہمارے کئی یونٹوں کے پاس چینی اسلحہ ہے۔ تو پھر اس سے کیا ہوتا ہے کہ اگر یہ ۶۲، ۷ ہے۔ بھلا اسے یکدم، براہ راست سیدھا، ایف ایس ایف یا کسی بھی کھاتے یا جو کہ میرا کھاتہ ہے۔ کس طرح ایف ایس ایف کے کھاتے میں ڈالا جا سکتا ہے۔ اس میں اتنی جوڑ لگا دینے والی کونسی بات ہے؟ وہ کیا دکھانے کی کوشش کر رہے تھے۔" کیا تم نہیں

جانے کہ JADO کے پاس ایسا امونیشن ہے۔ یہ JADO یا جادو کیا ہے۔ میں کسی کو جادو یا بازہ اور وڑہ آدم خیل بھیج رہا ہوں کہ وہ جاکر ان چیزوں کو دیکھے۔

یہ ایک ڈراما ہے۔ سعید احمد ڈیفنس سیکرٹری کو ایک خط لکھ کر اپنی اہمیت جتلانا چاہتا ہے۔ وہ یہ جانتا ہے۔ وہ مجھے فون کر کے پوچھ سکتا تھا کہ یہ ۶۲۔ ۷ ہے۔ تو اس سے بھی کیا ہوا؟ اس سے کیا ثابت ہوتا ہے۔ جب مجھے خط ملا تو میں چکرا گیا۔ وہ بتاتا ہے اور وزیر اعظم نے مجھے کہا "میرے ساتھ چالاکی کرنے کی کوشش نہ کرو"۔ میں رپورٹ دیکھوں گا۔ رپورٹ دیکھنے کے بعد میں فیصلہ کروں گا۔ اب ۔ کیا یہ ایک نارمل چیز نہیں ہے کہ رپورٹ تو دیکھنے دو۔ آخر آپ اتنے پریشان کیوں ہوں؟ الجھن کیا ہے! مجھے رپورٹ دیکھنے دو، جب میں نے مبینہ طور پر اسے کہا تم میرے ساتھ چالاکی کرنے کی کوشش کیوں کر رہے ہو تو وہ بتاتا ہے کہ اس نے یہ جواب دیا۔ "عام طور پر یہ کہا جا رہا ہے کہ رپورٹ شائع نہیں کی جائے گی"۔ "کیوں؟" "کیونکہ عام طور پر ایسی رپورٹیں شائع کرنے کا رواج نہیں۔ لیکن ایسا مطالبہ کیا جائے گا۔" حمود الرحمان رپورٹ شائع کرنے کا مطالبہ بھی کیا جائے گا۔ اس میں بھی لوگوں کو شک اور وہم ہے کہ آپ کی رپورٹ سات برسوں میں شائع ہوگی یا نہیں ہوگی۔ اس طرح ایک مثال قائم ہو جائے گی۔" وہ دلیل دیتا ہے۔

میرا خیال ہے، میں کوئی نسبت یا خصوصیت بتانا چاہتا کہ ہائی کورٹ شفیع الرحمن رپورٹ میں جو کچھ بھی ہے۔ اسے ریکارڈ پر لا چکی ہے۔ سوائے خود اس رپورٹ کے شاید وہ بھی یہی سمجھتے ہوں کہ اگر اسے شائع کیا گیا تو پھر حمود الرحمان رپورٹ شائع کرنے کیلئے ایک مثال مل جائے گی۔

اس نے بہت سے دلائل دیے۔ "جناب یہ حمود الرحمان رپورٹ کے مطالبے پر ناموافق اثر ڈالے گی۔ یہ مطالبہ کیا جانے لگے کہ حمود الرحمان رپورٹ بھی شائع کی جائے۔ میں نے جواب دیا" اگر یہ ناموافق بھی ہوگی تو میرے لیے منفی یا ناموافق نہیں ہوگی۔ اگر یہ ناموافق بھی ہوگی تو یہ مجھے اس میں گھسیٹ نہیں دے گی۔ اس کا تو عام انتظامیہ پر بڑا اثر پڑے گا۔" تو یہ تھا اس کا نقطہ نگاہ، جس پر میں نے اسے کہا "آخر تم میرا وقت کیوں ضائع

کر رہے ہو۔ تم مجھے اس پر ایک لمبا لیکچر پہلے ہی دے چکے ہو کہ اگر یہ رپورٹ شائع کی گئی تو پھر دوسری مختلف رپورٹوں کو شائع کرنے کا مطالبہ بھی کیا جائے گا۔ جیسے راولپنڈی مقدمہ سازش کی رپورٹ، اور پھر یہ کیس اور وہ کیس، اور تمام ایسے کیس۔ ملتان، جہاں فائرنگ ہوئی تھی اور جہاں یہ پوچھا جا رہا تھا کہ کیا رپورٹ شائع ہوگئی یا نہیں۔ اس لیے اسے بند ہی رکھا جائے۔ ورنہ اس سے پینڈورا کا صندوق بلا وجہ کھل جاتا۔ یہ اس کا خیال تھا کہ یہ ناموافق ہوگا۔ ٹھیک ہے لیکن رپورٹ میں جو کچھ دریافت ہوا ہے وہ میرے خلاف نہیں ہے۔ ۶۲۔ بھی میرے لیے ناموافق اور خلاف نہیں جاتا۔

یہ کہا گیا ہے کہ میرا نام ایف آئی آر میں درج کیا گیا تھا۔ میں نے اپنی محدود حیثیت میں یہ عرض کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کا کوئی مفہوم نہیں نکلتا۔ میں یہ یاد کسی چیز کو درج نہیں کیا اور میرا محرک۔

یاد رہے پہلے کہتے ہیں میں تحریک میں ہوں۔

وہ کہتا ہے "میرے بڑے" اور یہ ایف آئی آر میں ہے اور ایف آئی آر یہاں بہت اہم اور فیصلہ کن سمجھی جا رہی ہے۔ تو پھر وہ کہتا ہے کہ یہ تو دوسروں نے کہا تھا کہ میں بیحد بے چین ہوگیا تھا۔

آخر اسے کیسے معلوم ہوگیا کہ میں "بے چین" ہوگیا ہوں۔ میں اتنی آسانی سے بے چین ہونے والا نہیں ہوں۔ آخر اس میں ایسا کیا ہے جو مجھے بے چین کر دے۔ یہ کوئی سٹیم رولر تو نہیں ہے۔ یا کوئی بڑی تحریک چلی آ رہی ہے کہ میں سب سے پہلے بے چین ہوگیا۔ حالانکہ میرے بے چین ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اور پھر یہ بے چینی اس لیے کہ میں اس کا صفایا کرنا چاہتا ہوں۔ کہ وہ بے چین ہوگیا اور اس نے چاہا کہ پھر اس کو قائم کر دیا جائے لیکن یہ ELI MINATION (صفایا یا خارج کرنا) کیوں؟ اس لیے کہ یہ لفظ اس دستاویز میں آئے ہیں جو ہائی کورٹ کے سامنے بیگم نصرت بھٹو کے اس کیس میں پیش کی گئی تھی جس میں مارشل لاء کے جواز کو چیلنج کیا گیا تھا۔ اس میں یہ دکھایا گیا تھا کہ جنرل ٹکا خان جو اس وقت چیف آف سٹاف تھے بلوچستان میں بغاوت کا ذکر کرتے ہوئے یہ سفارش کی تھی کہ

ایک بہت بااثر، بہت طاقتور باغی کو، جو کئی فوجی افسروں اور جوانوں کو ہلاک کر چکا ہے۔ اس کے خلاف کارروائی کی جائے اور ہم اس کا صفایا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں"۔

مَیں کہتا ہوں ٹھیک ہے۔ پہلے یہ بتایئے کہ کیا بلوچستان میں بغاوت ہوئی تھی یا نہیں؟ اگر وہاں بغاوت نہیں ہوئی تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک سفاکانہ قتل تھا۔ اور اگر وہاں بغاوت ہوئی اور واقعی بغاوت ہوئی اور اب آپ جانتے ہیں کہ وہ بغاوت کس حد تک تھی۔ اس بغاوت کا دائرہ کتنا وسیع تھا اور کارروائیاں کتنی پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ ایک سفارش یا معلومات کہ ہم اسے ختم کرنے والے تھے۔ وہاں ایک جنگ، ایک چھوٹی جنگ لڑی جا رہی تھی جیسے ایک خانہ جنگی یا بلوچستان میں ایک بغاوت، اور وہ شخص (جس کا ذکر ہوا ہے متعلقہ آدمی) اب بھی زندہ ہے۔

اس لیے بے چینی اور "صفایا کرنے" کا مسئلہ سرے سے پیدا نہیں ہوتا۔ مقصد صرف اتنا ہے کہ ایا مجھے ختم کرنے کا ایک خاص طریقہ اختیار کر کے میرا صفایا کرنا چاہتے ہیں۔ ایک اعتراف کرنے والا شخص ملزم میاں عباس ہے۔ وہ ہر وقت گیت ہی گاتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ اس کے بیان سے ہر شخص صفایا کرنے کے اس طریقہ کار سے آگاہ ہو جاتا ہے جس سے میرا صفایا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ سو مسئلہ ایف آئی آر کا نہیں نہ بے چینی کا نہ صفایا کرنے کا...

یور لارڈ شپس، اس سے پہلے اس نکتے پر دلائل دیے جا چکے ہیں کہ ملزم کا رویہ کیا ہے لیکن پھر بھی۔ اس میں رویہ کا مسئلہ کہاں سے آگیا؟ اس کے بعد اس نے کہا کہ وہ دو تین وجوہات اور اسباب بتانا چاہتا ہے کہ اس کے علاوہ اور کوئی محرک نہیں ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مَیں یہ کیسے جان سکتا ہوں کہ کتنے لوگ ایسے ہیں جو محرک بن سکتے ہیں؟ لیکن بات یہ کہی جاتی ہے کہ ان سب لوگوں میں سے کسی کو بھی محرک قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مَیں اتنا جانتا ہوں کہ وہ ہمیشہ مجھ سے قصور میں اپنی پریشانیوں کا ذکر کرتا۔ اسے اس آدمی سے بچایا جائے۔ اس سے تحفظ دلوایا جائے۔ کئی ایف آئی آر درج کرائی گئیں۔ طرح طرح کے لوگ، یہ آدمی اور وہ آدمی، لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جو جرم کا محرک بن سکتا ہو۔ کسی دوسرے شخص کی اس سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ اس لیے کوئی دوسرا اس جرم کا محرک

نہیں بن سکتا۔ کوئی چالان پیش نہیں کیا گیا۔ مقدمے سراغ کے بغیر ہی رہا۔

مائی لارڈ، یہ کوئی پہلا مقدمہ تو نہیں ہے کہ جس میں کوئی سراغ نہ ملا ہو اور وہ ادھورا رہ گیا ہو۔ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم کو اسی شہر راولپنڈی میں گولی مار دی گئی۔ مجھے یاد نہیں آتا کہ کوئی ایف آئی آر درج کروائی گئی ہو۔ ممکن ہے میں ٹھیک نہ کہہ رہا ہوں۔ لیکن اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو مجھے یاد نہیں آتا کہ کوئی ایف آئی آر درج کرائی گئی ہو۔ جب اس ملک کا ایک اہم رہنما قتل کر دیا گیا تھا۔ اسے صرف دن دیہاڑے ہی قتل نہ کیا گیا تھا بلکہ ایک جلسے میں قتل کیا گیا۔ قاتل کو نجف خان نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اور نجف خان کو ترقی دیدی گئی۔ نہ صرف یہ کہ نجف خان کو ترقی دی گئی۔ بلکہ تحقیقات کی اجازت بھی نہیں دی گئی اور پھر آخر میں پارلیمنٹ کے شدید دباؤ کی وجہ سے سکاٹ لینڈ سے کوئی صاحب، ایک افسر یوری ایک مختصر سے عرصے کے لیے آئے۔ مسٹر یوری نے سکاٹ لینڈ سے ایک رپورٹ بھیجی۔ جس میں الزام لگایا گیا تھا ان کے ساتھ قطعی تعاون نہیں کیا گیا۔ بیگم لیاقت علی خان چیخ چلا رہی تھیں۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ میرے خاوند کی ایف آئی آر کہاں ہے۔ میرے خاوند کے قتل کی تحقیقات کیوں نہیں کی جا رہی ہیں۔ لیکن انہیں ایک سفیر بنا کر عمر بھر کے لیے باہر روانہ کر دیا گیا۔

اگر اس کیس کا سراغ نہیں ملا تو پھر مجھے بھی اس خود کار طریقہ کار کے تحت دفن نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ میں نے کل عرض کیا تھا۔ کہ اہل روم جو کرتے ہیں ہم ویسا نہیں کرتے بلکہ وہ کرتے ہیں جو روما نیہ والے کرتے ہیں۔ اب یہاں جو خلا ہیں یا ان لوگوں میں دوسری خامیاں ہیں تو اس کا میں ذمے دار نہیں ہوں کہ جن کی وجہ سے اس کیس کا سراغ نہیں لگ سکا۔ اب میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کتنے ایسے مقدمے ہیں جن کا کوئی سراغ نہیں لگایا جا سکا۔ ان کی بھی ایک فہرست بنی چاہیے۔ وقت کی ریت تیزی سے گرتی چلی جا رہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی کارکردگی بھی لوگوں کے ذہنوں میں آنی چاہیے۔ اس طرح جان سکیں گے کہ کتنے ایسے کیس ہیں جن کا سراغ نہیں لگ سکا۔

مائی لارڈز، مجھ پر تنقید اور اعتراض کرنے والے جو ہیں۔ مسٹر بختیار نے ان کا حوالہ دیا

ہے۔ راؤ خورشید اور کہا جاتا ہے کہ راؤ خورشید نے مجھ پر دوسرے لوگوں سے کہیں زیادہ خطرناک اور شدید حملے کیے۔ میں اتنا عالی ظرف ہوں کہ میں نے اسے اسمبلی کا ٹکٹ دے دیا۔ حالانکہ اس نے اس کے لیے درخواست بھی نہیں دی تھی۔ اور پھر راؤ خورشید اکیلا ہی تو نہیں تھا کہ جو مجھ پر تنقید اور اعتراض کرتا تھا۔ ولی خاں اور اصغر خاں ایسی تقریریں کیا کرتے تھے۔ جن میں کہا جاتا تھا کہ میرے سر میں گولی لگے گی۔ اور کوئی گولی کسی وزیر اعظم کو نہیں پہچانتی۔ اس قسم کی تقریریں تھیں جو کی جاتی تھیں کہ وزیر اعظم کے گھر کی دیواریں توڑ دی جائیں گی۔ اس قسم کی تقریریں تھیں جو چارسدہ اور دوسرے مقامات پر کی جاتی تھیں۔ لیکن میں خوفزدہ نہیں تھا وہ تقریریں کر سکتے تھے۔ ان کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ ہر طرح کے طعنوں اور چوٹوں کا مجھے نشانہ بنایا جاتا تھا۔ میرے خلاف وحشیانہ الزامات لگائے جاتے تھے۔ خواجہ رفیق کا نام لیا جا چکا ہے۔ مائی لارڈز یقین کیجیے۔ مجھے اتنا بھی معلوم نہیں تھا کسی خواجہ رفیق کا کوئی وجود بھی ہے۔ اب جا کر مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس کا تعلق نوابزادہ نصر اللہ خاں کی پی ڈی پی سے تھا۔ لیکن میں اس شریف آدمی کو بالکل نہیں جانتا تھا۔ میں اس وقت اسے قطعی نہیں جانتا تھا۔ جب مجھے بتایا گیا کہ ایک سیاست دان خواجہ محمد رفیق کو گولی مار دی گئی ہے اسے میری لاعلمی قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ اس سے پہلے میں نے خواجہ رفیق کا نام نہیں سنا تھا۔

یہاں ولی خاں پر ہونے والے حملے کا ذکر کیا گیا ہے۔ جب وہ دیر گئے تھے اور وہاں ان پر حملہ ہوا تھا۔ وہ اپنے ساتھ خان آف جندول کو لے گئے تھے۔ جن کے بارے میں عام شہرت ہے کہ وہ ایک ظالم مستبد ہے۔ ایوب خان کے زمانے میں انہیں لاہور بھجوا دیا گیا۔ انہیں جلا وطن کر دیا گیا تھا۔ پندرہ دنوں کے بعد ولی خان انہیں واپس اپنے ساتھ لے کر جا رہے تھے۔ وہاں شدید تناؤ تھا۔ لوگ مورچوں میں بیٹھے تھے اور اعلان کر رہے تھے۔ "ہم اس آدمی کو واپس آنے کی اجازت نہیں دیں گے۔"

میں نے ولی خان کو متنبہ کیا کہ وہ خان آف جندول کو اپنے ساتھ وہاں واپس لے جانے کے ارادے کو ملتوی کر دے۔ کیونکہ وہاں شدید تناؤ پایا جاتا ہے۔ اور جانا ہی ہے

تو پھر پورے حفاظتی انتظامات کر لیے جائیں۔ کیونکہ وہاں کسان ہتھیار سجائے تیار کھڑے ہیں حملہ ولی خاں پر نہیں کیا گیا تھا بلکہ فائرنگ کالونائے پر ہوئی تھی۔ تو یہ نوعیت ہے ولی خاں پر پہلے حملے کی۔ دوسرے حملے ان پر چارسدہ میں کیے گئے۔ جہاں وہ ایک جیپ میں جا رہے تھے۔ کہ وہ کسانوں اور جاگیرداروں کی جوابی فائرنگ کی زد میں آ گئے۔ میں نے اسے کہا کہ وہ جس کے لیے چاہے تحقیقات کے لیے مامور کیا جا سکتا ہے۔ یہ اس کے اپنے انتخاب کے مطابق ہوگا۔ ولی خاں نے ارباب ہدایت اللہ کا نام لیا۔ اس کے بہت قریب تھا اور ہم نے اس کا تقرر کر دیا اور کہا اسے ہی تحقیقات کرنے دو۔

اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ اسد اللہ مینگل قتل کر دیا گیا۔ یہ بہت اہم اور سنجیدہ بات ہے۔ مائی لارڈز ہم لڑتے تھے۔ یقیناً ہم آپس میں لڑتے تھے۔ لیکن یقیناً ہماری لڑائی کی ایک سطح بھی ہوتی تھی۔ بغاوت کا پرچار ہونا واقعی ایک بڑی بدقسمتی تھی۔ اس کے باوجود ہم اس سطح تک نہیں جھکے جن کا الزام لگایا گیا ہے۔ مائی لارڈز وہ جانتے ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمارے لڑنے کا یہ انداز نہیں ہے۔ عطاء اللہ مینگل کے بیٹے کا نام یہاں لے کر وہ خود اپنے آپ کو بہت زیادہ نقصان پہنچا رہے ہیں۔ جنرل ٹکا خان ساری کہانی جانتے ہیں۔ اور میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جاننا چاہتا۔ لیکن وہ مجھے اپنے ان چھوٹے چھوٹے کانٹوں، کھیلوں اور چالاکیوں میں کیوں اُلجھاتے ہیں۔ میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ میں ایک بہت اہم قبیلے کے سردار کے بیٹا کا صفایا کر دوں۔ جو ایک مینگل ہے اور میرا پڑوسی بھی ہے۔

بلوچستان میں بغاوت کے باوجود میں نے ان کے بیٹوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔ مری کے بیٹے مجھے ملنے کے لیے زیارت آئے۔ ہماری وہاں چودہ یا اٹھارہ گھنٹے تک کانفرنس ہو رہی تھی۔ میں ان سے ملنے کے لیے کانفرنس سے اٹھ کر گیا۔ لڑائی کے باوجود وہ مجھے "انکل" کہہ کر مخاطب کر رہے تھے اور میں ان کی فیاضی سے متاثر ہو گیا۔ تمام تر پریشانی اور گڑبڑ کے باوجود وہ مجھے "انکل" کہہ رہے تھے۔ بے ریا کھرے لوگ کھری بات ہی کرتے ہیں۔ میں کسی قدر بوکھلا گیا تھا۔ کہ یہاں ان سے لڑائی ہو رہی ہے اور وہ دونوں

اتنے مہذب اور نرم خو تھے کہ مجھے انکل کہہ کر پکار رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہماری کار کراچی پکڑی گئی ہے۔ انکل کیا آپ اسے لے لیں گے۔ میں نے کہا "بیٹا ضرور ہو جائیگا"

میں نے بزنجو کو پیغام بھیجا کہ میں اس کے بیٹے بیزن کو رہا کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ بیزن میرے اپنے بیٹے کی طرح ہے۔ میں نے اسے کہا تھا "میری لڑائی تم سے ہے میری لڑائی بیزن سے نہیں ہے۔" اس گڑبڑ کے خاتمے کے بعد میرے افغانستان جانے سے پہلے بیزن مجھے ملنے آیا۔ اس نے مجھے خراج تحسین پیش کیا کہ میں گڑبڑ پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ میں نے اسے منع کیا کہ وہ ایسا نہ کہے کیونکہ یہ بغاوت ایک بدقسمت باب تھا۔ میں نے کہا یہ اب بند ہو چکا ہے اور ہم واپس آگئے ہیں اور اب ہمیں نئے سرے سے شروع کرنا چاہیئے۔ یہ صورت حال غیر فطری تھی۔ وہ یہ جان کر حیران رہ گیا کہ اتنی کامیابی حاصل کرنے کے باوجود میں نے جان لیا تھا کہ یہ صورت حال غیر فطری تھی۔

ہماری لڑائی کا اپنا ضابطہ اخلاق ہے۔ ہم گھٹیا سطح پر نہیں لڑتے۔ خود سردار مینگل بھی یہ جانتے ہیں۔ اس کے جاسوس چاروں طرف موجود ہیں۔ میں تو یہاں تک تیار ہوں کہ قبائلی جرگہ یہ فیصلہ کرے کہ کیا میں کسی طرح بھی اس کا ذمے دار ہوں۔

شیرپاؤ کے لیے کیا کہیئے گا؟ وہ میرے لیے بیٹے کی طرح تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ شیرپاؤ کے قتل میں میرا ہاتھ ہے۔ آفتاب ایک ضابطہ اور اصول رکھنے والا آدمی ہے۔ آفتاب شیرپاؤ میرے ساتھ کبھی تعاون نہ کرتا یا پاکستان پیپلز پارٹی میں نہ ہوتا۔ اگر اس کے بھائی کو ذوالفقار علی بھٹو نے قتل کیا ہوتا۔ شیرپاؤ اس کا بھائی تھا۔ اسے قتل کر دیا گیا۔ وہ پاکستان کے لیے قتل ہوا۔ اپنے وطن کے لیے قتل ہوا۔ وہ میری پارٹی سے تعلق رکھتا تھا۔

میری اپنی زندگی پر کتنے ہی قاتلانہ حملے ہوئے۔ کیا میں نے خود ہی ان کا انتظام کیا تھا۔ مجھ پر قاتلانہ حملے قبائلی علاقے، مری، بگٹی علاقے میں ہوئے۔ اور ان سے اپنی اور شیرپاؤ کی دو مثالوں سے قطع نظر خان اچکزئی ......

چیف جسٹس نے رائے دی کہ یہ امور ریکارڈ پر نہیں ہیں۔ مسٹر بھٹو نے کہا کہ

خصوصی وکیل سرکار کو ان پر دلائل دینے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ جب وہ دلائل دے رہے تھے تو یہ ریکارڈ پر موجود نہیں تھے۔ چیف جسٹس نے کہا کہ ان کے خلاف جو مقدمہ چل رہا ہے اس کی بنیاد ان امور پر نہیں رکھی گئی۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو۔ کئی مواقع پر آپ کہہ چکے ہیں کہ ہم ریکارڈ کے مطابق چلیں گے" آپ نے مجھے کہا تھا کہ یہ سب کچھ انصاف کے مفاد میں کیا جا رہا ہے۔ انصاف ریکارڈ سے بلند تر ہے۔ لارڈ ڈینس نے حالیہ کئی مقدموں میں قانون مساوات وعدل کے بارے میں اپنی تشریح وتعریف بیان کی ہے۔ میں بھی یہاں انصاف اور دادرسی کے حق اور انصاف کے لیے آیا ہوں۔ جسے عدالت از راہ عنایت قبول کر چکی ہے۔ ہائی کورٹ کا ریکارڈ ناقص ہے۔ اس میں تحریف کی گئی ہے۔ اسے اپنے طور پر تیار کیا۔ اس میں جوڑ توڑ اور ساز باز کی گئی ہے اور میں اس کا بائیکاٹ کر چکا ہوں۔ اس کے ریکارڈ اور فیصلے میں بڑے بڑے خلا ہیں ۸ نومبر کو جو حکم صادر کیا گیا اس کے بارے میں کہا گیا ہے۔" سپریم کورٹ کے فیصلے کی روشنی میں۔" جو کہ دس نومبر کو دیا گیا تھا۔ اس میں اس طرح کی شدید خامیاں اور کمزوریاں ہیں۔ اگر آپ مجھے یہ کہتے ہیں کہ میں ریکارڈ کے اس تنے ہوئے رستے پر اکیلا ہی چلوں تو پھر مائی لارڈز، میں یہ عرض کروں گا تو پھر یہ ایک غیر ضروری مزاحمت اور رکاوٹ ہے۔

مسٹر بھٹو کے دوبارہ بیان جاری کرنے سے پہلے ایک تبادلۂ خیالات ہوا۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو۔ ہائی کورٹ میں اس کا ذکر کیا گیا کہ تاج پورہ میں کھر کے جلسے میں سانپ بھجوائے گئے تھے۔ آخر وہ بادشاہ سے بھی زیادہ اس کا وفادار کیوں ہے؟ کھر بدستور اپنی یہ شناخت کرا رہا ہے کہ وہ میرے ساتھ ہے۔ وہ اس وقت میرے ساتھ رہا جب تک وہ لندن نہیں گیا۔ اگر میں سپیروں کو کھر کے قتل کے لیے یا کوئی ایسی ہی حرکت کرنے کے لیے بھیجتا تو وہ میرے ساتھ کندھے سے کندھا ملائے کھڑا نہ رہتا۔ میں کھر کے لیے سانپ بھیجتا تو آج وہ سانپوں کے گڑھے میں دوسرے لوگوں کے ساتھ ہوتا۔ اگر اس کے دل میں میرے خلاف رنجش ہوتی تو وہ اس حد تک نہ جاتا کہ اس کی جائیداد تک ضبط کر لی گئی اور وہ لندن میں بیٹھا ہے۔

دلائی کیمپ

دلائی کیمپ کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ مائی لارڈز، نام نہاد دلائی کیمپ میں شامل لوگوں میں سے ایک کا تعلق پاکستان پیپلز پارٹی سے ہے اور اس نے اگست ۱۹۷۳ء میں پیپلز پارٹی سے ٹکٹ کے لیے درخواست دی تھی۔

اب مسئلہ تاری کا ہے۔ تاری بہت قابلِ اعتماد ہے کیونکہ اس نے میرے خلاف مارشل لاء کے نفاذ کے بعد ہائی کورٹ میں مقدمات درج کرائے ہیں۔ ایک ایسا ہی مقدمہ رجسٹرڈ کیا گیا تھا جس کی سماعت ذکی الدین پال نے مری میں کی۔ جس میں تاری نے ایک بیان دیا۔ جس کا ذکر میں کرنا نہیں چاہتا۔

یہ ایک ایسے آدمی کا معاملہ ہے۔ جسے میں اس کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے پنجاب گورنمنٹ میں دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ پنجاب حکومت کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ تھا۔ میں نے اس کی کمزوریوں کی وجہ سے اسے حکومت سے نکال دیا جس کے نتیجے میں اس کی مخالفت بڑھتی گئی۔ تحریک استحقاق میں قصوری نے کہا کہ اس پر جو بعض حملے کیے گئے ان میں تاری کا ہاتھ تھا۔ وہ قومی اسمبلی سے مطالبہ کر رہا تھا کہ تاری کو بلایا جائے تاری کے دل میں میرے لیے غصہ اور رنجش تھی۔ کیونکہ میں نے اسے پنجاب کی حکومت سے نکال دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں نے اسے نقصان پہنچایا ہے۔ جس کے نتیجے میں اس نے دفعہ ۳۰۷ اور ۲۱۲ کے تحت میرے خلاف درج کرا دیے۔ اس کے باوجود، تحریک استحقاق میں قصوری کہتا ہے کہ اس پر جو حملے ہوئے۔ ان میں زیادہ یا کچھ حملوں کا منصوبہ تاری نے بنایا تھا۔ کیونکہ تاری اسے فون کرتا اور دھمکیاں دیتا تھا۔ اس لیے تاری کو طلب کیا جائے۔

آنریبل چیف جسٹس: میرا خیال ہے کہ اس وقت تاری حکومت میں تھا۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو: مائی لارڈز، میں جنوری ۱۹۷۲ء سے کھر کو ترغیب دے رہا تھا کہ وہ تاری کو حکومت سے نکال دے۔ اور اس مسئلے پر کئی میٹنگیں ہوئی تھیں۔

میاں انور علی جو اس وقت ڈی آئی جی تھے۔ انہوں نے مجھ سے پہلی بار تاری کا ذکر کیا تھا۔ میں نے پوچھا کہ یہ افتخار تاری کون ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ وہ (پیپلز پارٹی کو) بہت بدنام کر رہا ہے۔ جنوری ۱۹۷۲ء سے میں کھر کو ترغیب دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ اسے چھوڑ دے۔ تاری کو جب سے معلوم تھا کہ میں اسے پسند نہیں کرتا۔ اس کی کمزوریوں کی وجہ سے اسے پنجاب حکومت میں دیکھنا نہیں چاہتا۔

سعید احمد کے بیان میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ عوامی سطح پر تحقیقات کے لیے بھیجا گیا تھا کہ کیا ٹھیک خطوط پر کام ہو رہا ہے۔ تو پھر وہ اپنے آپ کو کس طرح معصوم کہتا ہے۔ اس بیانات میں جو تضادات ہیں۔ وہ واضح ہیں۔ اس کے نتیجے میں یہ کیوں اصرار کیا جاتا ہے کہ سعید احمد بے خطا ہے۔

کہا گیا ہے کہ اہم فوجداری مقدمات میں ایف آئی آر کی قدر و منزلت کم نہیں کی جا سکتی۔ مسٹر جسٹس وحیدالدین نے اس کا جواب دیا تھا کہ جو کچھ ایف آئی آر کہتی ہے وہ اتنا ہے کہ جو حملہ ہوا اس کی وجہ مسٹر بھٹو کی تقریر تھی۔ اس کے بعد لیڈر لارڈشپس، چیف جسٹس نے کہا کہ ایف آئی آر میں درج آخری پیرے کی دراصل کیا اہمیت بنتی ہے؛ کیا وہ مسٹر بھٹو پر اس کے بعد ہونے والی فائرنگ کا الزام لگا رہا ہے۔ یا وہ یہ کہہ رہا ہے کہ اس پر حملہ مسٹر بھٹو کی تقریر کی وجہ سے ہوا ہے؛ مسٹر جسٹس وحیدالدین نے پھر یہ بات دہرائی کہ ۳؍جون ۱۹۷۴ء کو جو واقعہ اسمبلی میں پیش آیا وہ حملے کی ایک وجہ ہے۔ مسٹر جسٹس حلیم نے سوال کیا کہ اس بنا پر دوسرے تمام جواز خارج ہو جاتے ہیں؛

اس کے بعد ایک سوال مسٹر جسٹس پٹیل کی طرف سے پوچھا گیا کہ ایف آئی آر میں اسلام آباد کے واقعہ کے بارے میں قصوری نے کسی محرک کا ذکر نہیں کیا۔ مسٹر جسٹس پٹیل پوچھتے ہیں کہ آخر کیوں، جواب دیا گیا "کیونکہ وہ خوف زدہ تھا۔" تو پھر یہی مسحور ہو گیا تھا یہ تو کوئی جواب نہ ہوا۔ اسلام آباد میں ہوائی فائرنگ ہوئی رہتی۔ اس لحاظ سے تو اسے اس وقت بے حد خوف زدہ ہونا چاہیئے تھا جب اس کے والد کا انتقال ہوا۔

مسٹر جسٹس حلیم کی رائے ہے کہ یہی جواز اس سازش کا محرک ہے۔ اگر اس جواز کو

ختم کر دیا جائے، اگر یہ جواز چلا جائے تو پھر سازش کی بنیادیں بھی خود بخود گر جاتی ہیں ۔ اس کا جواب 'ہاں' ہے ۔ اگر اس جواز کو ترازو میں رکھا جائے تو پھر استغاثہ کو اسے ثابت کرنا چاہیئے اگر اسے ثابت نہیں کیا جا سکتا تو پھر جسے تکلیف پہنچی ہے وہ ثابت کرے ۔

مرکزی شخص جو جواز پر ہے وہ خود مستغیث ہے ۔ یور لارڈ شپس جانتے ہیں کہ سازش کے لیے کسی محرک یا وجہ کا ہونا ضروری ہوتا ہے ۔ اسے فیصلہ کن اور حتمی تو قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ لیکن جواز اپنی نوعیت رکھتا ہے ۔ اس لیے میں اس جواز کے حصے پر زیادہ وقت دے رہا ہوں ۔ چونکہ جواز ضروری ہے اور صرف ایک ہی شخص نے حقیقت میں جواز بیان کیا ہے ۔ تو میں آپ کی اجازت سے اس کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں کہ استغاثے کے گواہ نمبر ایک کی گواہی اس جواز کے بارے میں کیا ہے ۔

اس پر تبادلہ ہوا کہ کیا اس نکتے کو رد کیا جا چکا ہے ۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو ۔ مائی لارڈز ، احمد رضا قصوری نے کہا ہے کہ دسمبر ۱۹۷۰ء تک ہمارے تعلقات اچھے تھے ۔ ہمارے تعلقات میں بگاڑ ۱۹۷۱ء کے آغاز میں ہوا ۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ بگاڑ کیوں پیدا ہوا ۔ ؟ اس کا بیان ہے کہ اسے اچانک معلوم ہوا کہ میں اقتدار کا بھوکا ہوں ۔ اس نے دو ایک باتوں کا ذکر کیا ہے ۔ اس نے پشاور کی پریس کانفرنس کا ذکر کیا ہے ۔ یہ پریس کانفرنس تھی ۔ اٹھائیسویں تقریر جس کا میں ذکر کر چکا ہوں ۔ پھر وہ کراچی کی تقریر کا حوالہ دیتا ہے ۔ "اِدھر ہم اُدھر تم" یعنی ۱۴ مارچ ... (۱۹۷۱ء (پروگریسو پیپرز لمیٹڈ) کی ہڑتال کو ایک اور وجہ قرار دیتا ہے ۔ ۱۹۷۲ء کی ہڑتال کے بعد ، اس کا بیان ہے کہ اس نے دستور پر دستخط نہیں کیے ۔ وہ ڈھاکہ چلا گیا اور پھر وہ میری ۳، جون کی تقریر کا ذکر کرتا ہے ۔

قصوری نے ایک موضوعی نتیجہ یا داخلی نتیجہ برآمد کیا ہے کہ میں اقتدار کا بھوکا بن گیا تھا ۔ اگر اس کا اشارہ سیاست کی طرف ہے تو سیاست یا سیاسی جماعتوں کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ اکثریتی جمہوری ذرائع کے ذریعے اقتدار میں آئیں اور یہ کوئی جرم نہیں ہے ۔ یہ تو عمل کا نام ہے ۔ کچھ لوگ اقتدار میں عقبی دروازے سے آتے ہیں ۔ لیکن

ہم ہمیشہ سامنے والے دروازے سے اقتدار میں آئیں گے۔ آخر اس پر یہ کیا اعتراض ہو سکتا ہے کہ ایک جماعت اقتدار میں آنے کی کوشش کر رہی تھی۔

پشاور میں مَیں نے اپنی پریس کانفرنس میں 'بائیکاٹ' کا لفظ بالکل استعمال نہیں کیا تھا۔ مَیں نے کہا تھا کہ ہم سمجھوتے کے لیے دباؤ ڈال کر، زیادہ وقت حاصل کرنے کے لیے کوشش کر رہے ہیں کہ کوئی سمجھوتہ ہو جائے تو ہم اسمبلی میں جائیں۔ کیونکہ لیگل فریم ورک آرڈر میں یہ طے پا چکا ہے کہ آئین کو ایک سو بیس دنوں کے اندر بنانا ہوگا۔ ورنہ اسمبلی توڑ دی جائے گی۔ ایسی مشروط صورت میں دو نتائج اور اسباب ہی باقی رہ جاتے ہیں۔ ایک" یہ کہ دونوں سیاسی نظریوں کے درمیان مکمل ہم آہنگی، جو ۱۲۰ دنوں میں طے نہ پا سکتی تھی۔ اور یا پھر یہ کہ ان تمام تنازعات اور ایشوز کو عمومی اتفاق کے خیال سے بالکل باہر پھینک دیا جائے۔ جیسا کہ ہم نے ۱۹۷۳ء کے آئین میں کیا تھا۔ یہی ہو سکتا تھا اور ہم اس کے لیے کہہ رہے تھے۔

لاہور کی تقریر، اس کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ اس لیے میں وقت ضائع نہیں کروں گا۔ کراچی اِدھر ہم اُدھر تم۔ اگلے ہی دن میں نے اپنی پریس کانفرنس کی روداد دیکھ کر اس کی تردید کر دی تھی۔ میں نے کہا تھا۔ (میری زبان پر دھیان دیجیے۔ میری اردو اچھی نہیں ہے۔ کیونکہ پیرزادہ شریف الدین بمبئی میں میرے ٹیوٹر تھے۔) مَیں نے اس کی مکمل وضاحت کی تھی۔ مَیں نے دراصل یہ کہا تھا۔

اِدھر سے ہم اُدھر سے تم مل کر ایک حکومت بنائیں۔

یعنی ایک بڑی شاندار مخلوط حکومت .....

مَیں نے یہ کیوں کہا کہ ہمیں ایک بڑی مخلوط حکومت بنانی چاہیے۔ اس لیے نہیں کہ میں ہر قیمت پر اقتدار میں حصہ لینا چاہتا تھا۔ مَیں نے مجیب الرحمان سے صاف صاف کہا تھا۔ دیکھو بھائی چھ نکات کا ڈھانچہ فیڈریشن کا نہیں بلکہ کنفیڈریشن کا ہے۔ اصل میں دو مختلف ریاستوں کے درمیان ایک اتحاد ہے جس کی تجویز آپ چھ نکات میں تجویز کر رہے ہیں۔ خدا کے لیے اسے ایک فیڈریشن بننے دو۔ اس میں سے زرمبادلہ

کا فارمولا نکال دو کہ صوبوں کے پاس ان کا اپنا زرِ مبادلہ ہو گا۔ اور ان کے اپنے سفارت خانے ہوتے جو تمام تجارت اور خارجہ تجارت کریں گے۔ اس لیے میں نے اس سے کہا آپ اسے نکال دیں اور ہم ایک فیڈریشن میں حزبِ اختلاف کی حیثیت سے بیٹھیں گے۔ تم فیڈریشن قبول کر لو۔ ہم بڑی مسرت کے ساتھ حزبِ اختلاف میں بیٹھیں گے۔

لیکن اگر آپ کنفیڈریشن بنانا چاہتے ہیں تو پھر اس صورت میں ایک ایک علاقے میں ایک اقلیتی پارٹی ہونے کی حیثیت سے کنفیڈریشن نہیں بنائی جا سکتی۔ اس صورت میں اگر آپ کنفیڈریشن بنانا ہی چاہتے ہیں تو پھر مغربی پاکستان کے عوام کی اکثریتی پارٹی کو لے کر ساتھ مل کر حکومت بنانی ہوگی۔ اس کنفیڈریشن میں پاکستان کے عوام کی اکثریت کو دونوں اطراف سے مساوی حیثیت دینی ہوگی۔ آپ کنفیڈریشن نہیں بنا سکتے کہ بساط الٹ کر اس کنفیڈریشن کے ذریعے مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان کا حکمران بنا دیں۔ یہ آپ ایسا نہیں کر سکتے کہ اقلیتی جماعتوں کے دو افراد کو اپنے ساتھ ملا کر اپنی بالادستی قائم کر سکیں۔

یہ بہت صاف اور سادہ تجویز تھی۔ اور میں مسلسل اس دستوری سطح پر بات کرتا رہا۔ میں نے ہر ممکن کوشش کی کہ اس سمجھوتے کے تصفیے کے لیے رضامند کر سکوں۔ وہ رضامند نہ ہوا اور یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ ہم واپس آ گئے۔ بہر حال یہ ہے اصل نکتہ۔ یہ تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں اقتدار کا بھوکا تھا۔ یہ تو ایک کوشش تھی کہ کسی طرح اسے فیڈریشن کے ڈھانچے کو قبول کرنے کے لیے رضامند کر لیا جائے۔ اور وہ کنفیڈریشن نظام کو ترک کر دے۔ لیکن جو کچھ نہیں کیا گیا، وہ ریکارڈ پر نہیں لایا گیا۔ اب آپ اس لحاظ سے چاہیں تو تکنیکی طور پر مجھے عدالت سے اٹھا کر باہر پھینکوا سکتے ہیں۔

لیکن یہی مسٹر احمد رضا قصوری ہے جو پاکستان پیپلز پارٹی کے تمام ایم این اے کی تمام میٹنگوں میں جو کلفٹن کراچی منعقد ہوئیں شریک ہو چکے ہیں۔ وہاں ایک انسٹی ٹیوٹ آف انجینیئرز ہے۔ جہاں اس نے تمام ایم این اے کے سامنے یہ حلف اٹھایا کہ میری حیثیت مطلقاً درست ہے اور یہ قومی مفاد میں ہے۔ اس نے وہاں ایک لمبی تقریر کی جس میں اس نے مجھے اس سلسلے میں سراہا اور کہا کہ یہ آخری جواب ہے جو دیا جا سکتا ہے اور ایسا ضرور کرنا

چاہیئے۔ اب میں نہیں جانتا کہ یہ ریکارڈ پر ہے یا نہیں ہے۔

آنریبل چیف جسٹس :۔ یہ کب ہوا۔؟ دسمبر ۱۹۷۱ء سے پہلے۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو :۔ اس کے بعد مائی لارڈ" ادہر ہم اُدہر تم کے بعد۔

آنریبل چیف جسٹس :۔ لیکن یہ تو مارچ ۱۹۷۱ء کی بات ہے۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو :۔ مائی لارڈ ۱۴ مارچ والی میری تقریر پارٹی کی پالیسی تقریر سمجھی جاتی ہے۔ جسے مسخ کر دیا گیا ہے۔ یہ اس سے بہت پہلے تھی ہم مجیب الرحمان سے آخری سمجھوتے کے لیے جانے والے تھے۔

آنریبل چیف جسٹس :۔ ۲۵ مارچ یا ۲۱ مارچ۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو :۔ وہ آیا اور اس نے ایک جاندار تقریر کی۔ اب میں آپ کو اس کے دوسرے پہلو کی طرف لے جانا چاہتا ہوں۔

آنریبل چیف جسٹس :۔ تو کیا آپ نے اس نکتے پر اس پر جرح نہیں کی تھی۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو :۔ نہیں، نہیں، نہیں۔

آنریبل چیف جسٹس :۔ جب اس نے ادہر ہم اُدھر تم کا حوالہ دیا تھا۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو :۔ مائی لارڈ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے کہا تھا کہ یہ ریکارڈ پر نہ ہوگا۔ وہاں مجھے شدید دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ جب کہ میں اب سمجھتا ہوں کہ جو کچھ ریکارڈ پر آرہا ہے، یور آنر اس سے کہیں زیادہ اہم ہیں" ہر بار جب میں اُٹھنے کی کوشش کرتا میں ہی جانتا ہوں کہ میرے ساتھ کیا پیش آتا۔ اس لیے بہت سے مواقع پر میں نے ایسی کوئی کوشش ہی نہ کی۔ میں اُٹھتا ہی نہیں تھا۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری بے عزتی کی جائے۔

"پاکستان پیپلز پارٹی میں بھی ایسے لوگ تھے جو چھ نکات کی حمایت کرتے تھے۔ ملک جعفر پاکستان ٹائمز میں چھ نکات کی حمایت کی میں مضامین لکھا کرتے تھے۔

آنریبل چیف جسٹس :۔ لگتا ہے کہ وہ یہاں بیٹھے ہیں۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو :۔ وہ چھ نکات کی حمایت میں مضامین لکھا کرتے تھے کہ ہم بھی

ان چھ نکات کو تسلیم کر لیں۔

آنریبل چیف جسٹس :۔ اور اس کے باوجود وہ آپ کی پارٹی میں رہے۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو :۔ اور وزیر مملکت بھی بنے۔ ایسے سیاسی اختلافات تو پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ یہ ذاتی اختلافات نہیں ہوتے۔ لوگوں کے مختلف خیالات ہوتے ہیں۔ وہ ایک وزیر بن گئے۔

اب ناصر باغ کا مسئلہ ... ناصر باغ کے بارے میں اس نے اپنے ہی خیالات سے اختلاف کیا ہے۔ ایک طرف تو وہ یہ کہتا ہے کہ مسٹر بھٹو نے ہمیں کہا کہ انہیں ہڑتال پر لے آؤ اور یہ اس نے اپنے بیان میں کہا ہے۔ اور دوسری طرف وہ کہتا ہے کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ پی پی ایل کو ختم کر دیا جائے۔ چونکہ میں ان پر بہت ناراض ہوا اس لیے انہوں نے یہ کام کر دکھایا۔ لیکن وہ لوگ کون تھے جو ناصر باغ میں بیٹھے تھے۔؟ وہ تین تھے۔ احمد رضا قصوری، مختار رانا اور عبدالحفیظ کاردار۔ اب اگر میں ان سے اتنا ہی ناراض تھا کہ پھر عبدالحفیظ کاردار کو پنجاب میں وزیر کیوں بنا دیا؟ صاف الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب میں ان پر اتنا ہی خفا اور ناراض تھا تو پھر میں عبدالحفیظ کاردار کو پنجاب کا وزیر نہ بناتا۔

اور پھر اس مہم (CAMPAIGN) نہیں بلکہ کیمپ، یہ بھی ایک جھوٹ ہے۔ یہ ضمنی انتخابات تھے۔ یہ ضمنی انتخابات اس وقت ہوئے تھے، آپ کو یاد ہو گا جب میری جماعت نے سب کو بے پناہ اکثریت کے ساتھ صاف کر دیا تھا۔ ایسے انتخابات کے بعد ضمنی انتخاب کی حیثیت محض ایک تکلف کی سی رہ جاتی ہے۔ میاں محمود علی قصوری اس نشست سے انتخاب لڑ رہے تھے۔ جو میں نے خالی چھوڑی تھی۔ یہ ایک چھوٹا ضمنی انتخاب تھا۔ میں لاہور محض اس لیے گیا کہ استحکام اور اتحاد کا مظاہرہ کر سکوں اور میں نے معمولی اشارے دیئے۔ میں نے مشورہ دیا کہ ہمیں بس ایک جلوس نکالنا چاہیئے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو وہاں تین یا زیادہ سے زیادہ چار آدمی پلے کارڈ موجود تھے۔ میں ساتھ نہیں گیا بلکہ کہا کہ جب یہ جلوس ختم ہو جائے گا تو میں پہنچ جاؤں گا۔ آخر ایسا کیوں۔؟ اس لیے کہ وہ بہرحال میری پارٹی کے آدمی ہیں۔ میں ان کے پاس جاؤں گا۔ میں ان کے پاس گیا۔" انھو

سنو اور گھر جاؤ" وہ سب بہت بھوک محسوس کر رہے تھے۔ وہ سب بہت خوش تھے کہ اس طرح کوئی ان کا بھرم باقی رکھنے والا آ گیا تھا۔ وہ باہر نکلے اور یوں قصہ ختم ہو گیا۔ اس معمولی سے واقعے کو قصوری نے کس طرح ایک بڑا مسئلہ بنا دیا ہے؟ کہ مَیں نے کہا کہ میں نے استعفیٰ دینے کے لیے قلم نکالا اور کہا کہ مَیں ایسا نہیں چاہتا ہوں۔ پھر قصوری کہتا ہے کہ چونکہ وہ ڈھاکہ چلا گیا تھا اس لیے میں مشتعل ہو گیا۔ مائی لارڈ، بھلا میرے لیے اس میں مشتعل کرنے والی کونسی بات تھی۔ ہم نے کہا کہ ہم ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کے اجلاس میں شریک نہیں ہوں گے اور اسمبلی کا اجلاس ملتوی کر دیا گیا۔ اس کے باوجود اگر وہ ڈھاکہ جاتا ہے تو اس سے مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔؟

آنریبل چیف جسٹس:۔ کیا وہ بعد میں گیا......

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو:۔ ہاں ہاں، جب اجلاس ملتوی ہو چکا تھا۔ لاہور میں میری ۲۸ فروری کی تقریر کے بعد۔ اس کے فوری بعد، وہ ڈھاکہ اس کے بعد گیا۔ مجھے اس کی کیا پرواہ کہ وہ اپنے ساتھ رس گلے لے کر گیا یا گلاب جامن۔ وہ اسمبلی میں تو نہیں جا رہا تھا۔ مَیں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ تم ڈھاکہ نہ جاؤ۔ یا تم ڈھاکہ نہیں جا سکتے۔ خواہ کچھ ہو..... میں نے صرف یہ کہا تھا کہ ہم بطور پارٹی اس وقت تک ڈھاکہ اسمبلی میں نہیں جائیں گے جب تک ہمارے درمیان سمجھوتہ طے نہیں پا جاتا۔ اس کے بعد وہ ڈھاکہ گیا تو اس سے مجھ پر اثر پڑتا ہے۔ اب اس کی چار تحاریک التوا۔ بہت اختصار سے بات کروں گا۔ اس نے پہلی تحریک التوا میں تاری کا ذکر کیا۔ تاری کے مسئلے کو تاری کے حوالے سے ہی بیان کیا۔ تاری ایسا آدمی نہیں ہو سکتا جو میری طرف سے کوئی کام کر رہا ہو۔

آنریبل چیف جسٹس:۔ مسٹر بھٹو، جب تک آپ تفصیلات میں نہیں گئے ہمارا تاثر یہ تھا کہ تب ایک صوبائی وزیر تھا۔ اور تاری اس پر دباؤ ڈال رہا تھا۔ اسے ہراساں کر رہا تھا لیکن شاید میں غلطی کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ مسٹر اعوان بہتر جانتے ہیں۔ کیونکہ ابھی وہ مرحلہ نہیں آیا تھا۔ کہ جب تاری اقتدار اور حمایت سے محروم ہوا ہو۔ وہ تب ایک صوبائی وزیر تھا۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو:۔ مائی لارڈ، مائی لارڈ، آپ اپنے آقا پر اس وقت غصہ کرتے

ہیں۔ جب وہ آپ کو نکال کر باہر پھینکنے والا ہو۔ وہ اس وقت غصہ نہیں کرتا جب اسے نکال باہر پھینکا گیا ہو۔

آنریبل چیف جسٹس :- ممکن ہے ایسا ہی ہوتا ہے۔ بالکل درست۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو :- اس کا نفسیاتی سبب یہ ہے۔ "مجھے نکال رہے ہیں۔ مجھے نکال رہے ہیں۔ میرے پیچھے پڑا ہے۔ میرے پیچھے پڑا ہے۔"

آنریبل چیف جسٹس :- لیکن اگر اسے یہ معلوم ہو جائے تو وہ دوبارہ اقتدار میں آنے کے لیے کوشش کر رہا ہو۔"

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو :- نہیں، نہیں وہ جانتا تھا۔ کیونکہ وہ اپنی لابی بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور میرا نکتہ یہ ہے کہ میں اس میں کس طرح ملوث کیا جا سکتا ہوں۔

آنریبل چیف جسٹس :- میں صرف اس بات پر رائے دے رہا ہوں۔ جو اس نے پارلیمنٹ میں کہی تھی کہ تاری کو دوبارہ میری طرف بھیجا جا رہا ہے۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو :- بات ختم ہوئی۔ میں اس میں ملوث نہیں تھا۔

آنریبل چیف جسٹس :- بالکل ٹھیک۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو :- اور پھر دوسری تحاریک استحقاق جن میں کہا گیا کہ اسے ٹیلی فون پر ڈرایا دھمکایا گیا ہے۔ ہائیکورٹ کے فیصلے میں کہا گیا ہے کہ مسٹر بھٹو کے اتنے زیادہ حامی تھے کہ وہ چاہتے تو اس کام سے اکیلے نمٹ سکتے تھے۔ مجھے بالکل علم نہیں کہ اسے ڈرانے ڈرانے دھمکانے کی ٹیلی فون کالیں کی جا رہی تھیں یا نہیں۔ اسلام آباد کے واقعے کے بارے میں اس نے کہا کہ وہ اس کے کسی کا بھی نام منسوب کرنا نہیں چاہتا اور میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ یہ واقعہ ۲ر جون والی تقریر کے فوری بعد پیش آیا۔ میں کوئی سکھ تو تھا نہیں کہ اپنی کرپان اسمبلی کے باہر نکال لیتا۔ جیسے ماسٹر تارا سنگھ نے لاہور میں نکالی تھی۔ اگر میں نے کرپان نکالی ہوتی تو مجھے معلوم نہ ہوتا کہ میں آج کہاں ہوں گا۔ وہ یہ کہہ رہا ہے کہ میں اس کا ذمے دار نہیں ہوں۔

آنریبل چیف جسٹس :- لیکن آپ کرپان نکالنے کے بعد کے خطرناک نتائج سے تو ضرور آگاہ ہوں گے۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو، ماسٹر تارا سنگھ پر کیا بیتی اور خضر حیات پر کیا گزری یہ ایک مختلف معاملہ ہے۔ یہ ایک تقریر تھی اور اس نے مجھ پر کسی طور بھی اس معاملے میں حملہ نہیں کیا۔ صرف آخری تقریر میں جب ظہور الٰہی اور اس نے یہ فیشن اپنایا۔ اور پھر اس نے اسی اپنے اصل مقصد کو ظاہر کرتے ہوئے میرے استعفےٰ کا مطالبہ کیا۔

اسلام آباد کے بعد کوئٹہ کا معاملہ آتا ہے۔ کوئٹہ بڑی عجیب بات ہے۔ جہاں تک کوئٹہ کا تعلق ہے۔ میں، اس پوری تصویر میں کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ مسعود محمود پہلے کہتا ہے کہ اس نے ٹیلی فون پر پیغام دیا ٹیلی فون پر کیا کہ اس آدمی سے خلاصی حاصل کر لو، اس آدمی سے نجات حاصل کر لو۔ لیکن اس کے بعد وہ اس سے کچھ مختلف بات کہتا ہے۔ اس بات پر ساز باز اور مصالحت کرنے کے لیے کہ میں نے اسے ٹیلی فون پر یاد دلایا اور میں ۲۹ جولائی کو کوئٹے میں تھا۔ ۲۹ جولائی کو وزیر اعظم کوئٹے میں تھے۔ احمد رضا قصوری ۱۳ ستمبر کو کوئٹے آتا ہے اور میں اسے جولائی میں یاد دہانی کراتا ہوں کہ وہ احمد رضا قصوری ۱۳ ستمبر کو آرہا ہے اور پھر وہ اپنے پہلے بیان کو بھی ہموار کرنے کے لیے کہتا ہے۔ نہیں نہیں یہ اطلاع زبانی دی گئی تھی اور اس کی یاد دہانی ٹیلی فون پر کرائی گئی۔ لیکن اس کا اس سے کوئی واسطہ نہیں کہ میں اس سے ملا تھا۔ اگر وہ مجھ ملا بھی تو ایک افسر کی حیثیت سے ملا۔

اس سے کیا بات ثابت ہوتی ہے۔ کہ میں نے اسے اس شخص کے لیے ہدایات دیں کہ وہ میلون روپرٹ ویلش کو بھی اس معاملے میں شریک کر لے؟ میں تو اس آدمی کو ٹھیک طرح سے جانتا بھی نہیں ہوں۔ میں نے اس کا محض نام سن رکھا تھا اور عطاء اللہ مینگل سے سنا تھا کہ میلون روپرٹ ویلش نام کا کوئی افسر یہاں ہے۔ اور پھر دوسری بات مائی لارڈ کہ یہ ویلش کہتا کیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ وہ پوری طرح لیس بیٹھا تھا۔ وہ امداد ہوٹل میں پوری طرح تیار بیٹھا تھا۔ وہ بتاتا ہے کہ وہ مسعود محمود کے لیے بیٹھا ہوا تھا۔ اور مسعود محمود اور ویلش کا باہمی معاملہ تھا۔ دونوں وعدہ معاف گواہ ہیں۔ اور اس نے مسعود محمود کو حیلہ بنانے کے لیے کہا اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ مجھ پر پاکستان دشمن کارروائیوں کا الزام بھی لگا سکتے ہیں۔ وہ بات یعنی جو غلام حسین پر پھبتیاں کی گئی تھی یعنی مرغی کے دل والا تو اس میں یہ لوگ مرغی کا دل رکھنے والے

بھی نہیں۔ بلکہ آلسں کریم ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اسے خوف تھا کہیں وہ خود نشانہ نہ بن جائے تو آج اس آدمی کو اس سے مختلف تاثر حاصل نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ ایسے آدمی کو محض دھمکی سے چھوتے ہیں۔ اور وہ لرزہ براندام ہو جاتا ہے۔ پھر آج کے متعلق کیا ہو گا۔

تم مقامات اور جگہوں سے قطع نظر کوئٹہ کو لیجیے جہاں ایک بغاوت، ۱۹۴۷ء سے شروع تھی، نمائی، لارڈ میرا رویہ کیا رہا؟ میں اس شورش کو کم سے کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں بار بار یہ کہہ رہا تھا کہ شورش اتنی زیادہ وسیع اور بدتر نہیں بلکہ یہ سارا غیر ملکی پروپیگنڈہ ہے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا تھا کہ شورش کو کم سے کم کیا جائے۔ اور یہ بات اپنی جگہ ہے کہ یہی وہ وقت تھا جب مجھ پر لنگاہ نے قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ تب میں نے کہا کہ یہ بات پریس میں نہیں آئے گی۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ بات کہی جائے کہ شورش وسیع پیمانے پر ہو رہی ہے۔ اور پھر مجھ پر فائرنگ ہوئی۔ اور پھر وہ سب چیزیں جو مری آباد میں ہوئیں۔

اب میں کوئٹہ کو چنوں گا؟ در واقعی اگر گمراہ کن تحقیقات کی جائیں گی تو پھر یہی کہا جائے گا کہ اس کام کے لیے بہترین جگہ کوئٹہ ہی ہو سکتی ہے اور ایسی ہی بات ہائی کورٹ میں کہی گئی۔ کیونکہ کوئٹہ میں گڑبڑ تھی۔ لیکن پنجاب کے ایک ایم این اے کے لیے نہیں۔؟ اس قدر زیادہ گڑبڑ تھی کہ پنجاب کے ایک ایم این اے کو وہاں گولی مار دی گئی۔ یا پھر ایک سندھ کے ایم این اے یا صوبہ سرحد کے ایک ایم این اے کو گولی مار دی گئی۔ کوئٹہ کو محدود اور پابند کر دیا جائے گا۔ کہ کوئٹہ محض بلوچوں کے لیے ہے اور اس میں بلوچوں یا کسی بلوچی کو ملوث اور شریک کر لیا جائے گا۔ لیکن اگر میں نے پاکستان بھر میں کسی جائے واردات کا انتخاب کرنا ہی ہوتا تو میں آخری شخص ہوتا جو کوئٹہ کو جائے واردات کے لیے انتخاب کرتا۔ کہ ایسے گڑبڑ کے موقع پر کوئٹہ کو جائے واردات چنتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسے انتخاب کیا گیا یا نہیں میں اس سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اور جو ہوا اس سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔

ایک اور پوائنٹ، یہ اقراری ملزم یہ کہتے ہیں کہ پہلی گولی آغا ارشاد نے ہوا میں چلائی قصوری کا بیان ہے کہ پہلی گولی اس کے ڈائنمو پر لگی۔ اب آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے پہلی گولی کی آواز ہی نہیں سنی۔ جہاں تک شکار کا تعلق ہے۔ میں ایک "پیشہ ور" ہوں۔

لیکن ایسی چیزوں کا ماہر نہیں ہوں۔ تو کیا آپ پہلی گولی جو ڈائنمو سے ٹکرائی اس کی آواز نہیں سنیں گے؟۔ میرے خیال میں آپ اس کی آواز سنیں گے اور یہی صحیح ہے۔ لیکن میں یہاں صرف تضاد واضح کر رہا ہوں۔ کہا گیا کہ اس نے ایک بش شرٹ پہن رکھی تھی۔ جی ہاں یہی کہا گیا ہے کہ بش شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ اور لاہور نومبر میں گرم ہو سکتا ہے۔ نہیں جی وہاں تو اس مہینے سردی ہو ہی نہیں سکتی۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ وہاں اتنی سردی تھی کہ انہوں نے کار کے سارے شیشے بند کر رکھے تھے۔ لیکن اس کے باوجود اس نے جو کچھ پہن رکھا تھا۔ وہ ایک بش شرٹ تھا۔

اب ماڈل ٹاؤن لیس منظر کی طرف آیئے۔ میں تفصیلات میں نہیں جاؤں گا۔ ۲ مئی ۱۹۷۱ء کے حملے کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ بھٹو کے حامی عناصر اس کے ذمے دار تھے۔ یہاں میں انتہائی ادب و انکسار کے ساتھ عرض کروں گا کہ پاکستان پیپلز پارٹی میں ایسے عناصر قطعی طور پر نہیں پائے جاتے۔ جنہیں بھٹو کے حامی یا مخالف کہا جا سکے۔ میں آج بھی پاکستان پیپلز پارٹی پر پورا کنٹرول رکھتا ہوں اور پیپلز پارٹی ایسی جماعت ہے کہ اس میں کوئی "چیٹھ گروپ یا لیگارڈ گروپ نہیں ہے۔ یہ ایک انقلابی پارٹی ہے۔ یہ عوام کی مضبوط اور سچی پارٹی ہے یہ ہمیشہ سے میرے کنٹرول میں رہی ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ ان پر بھٹو کے حامی گروپ نے حملہ کیا۔ بھٹو کے حامی گروپوں نے آپ پر قطعاً حملے نہیں کیے۔ قصور کے ان لوگوں کے بارے میں کیا خیال ہے۔ جن کے ساتھ تمہارے اختلافات یا مسائل اور دشواریاں تھیں؟ یہ یعقوب اعوان، طور اور ایسے ہی دوسرے لوگ؟ جو سمجھتے تھے کہ تم انتہائی خوفناک درندے بن گئے ہو۔ کہ ۱۹۷۰ء انتخابات جیتنے کے بعد..... (وہ پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر منتخب ہوا) ایک "بانی رکن" کی حیثیت سے..... بانی رکن والی بات بھی ایک غلط تصور ہے۔ پارٹی اپنی سرکاری پالیسی کے مطابق میدان میں آئی تھی۔ بانی ارکان پانچ یا چھ تھے۔ مسٹر جے۔ اے رحیم، میں خود۔ اور کچھ دوسرے، ہم نے جمع ہو کر یہ فیصلہ کیا کہ ایک جماعت بنائی جائے۔

بہرحال قصوری کہتا ہے کہ میں پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر منتخب کیا گیا۔ ٹھیک ہے

لیکن کس طاقت کے بل بوتے پر؟ مجھے یہ بتاؤ کہ تم سے کوئی ایک بھی اس سے پہلے کبھی کسی اسمبلی کے لیے منٹو مارلے اصلاحات کے زمانے سے منتخب ہوا تھا۔ حتیٰ کہ کبھی کوئی لوکل باڈیز کے لیے بھی چُنا گیا تھا۔ اور تم کہتے ہو "منتخب کیا گیا" بتاؤ کیا تمہارے خاندان میں سے کبھی کوئی قصور سے قومی یا صوبائی اسمبلی کے لیے رکن منتخب ہوا۔ اس حلقے سے میاں افتخار الدین الیکشن میں منتخب ہوئے تھے۔ یا ایک ارائیں سردار احمد علی کو منتخب کیا جاتا تھا

دراصل وہ ایک ایسا شخص ہے جو اقتدار کا بھوکا بن گیا۔ وہ ایک ایسا شخص ہے ہے۔ جو یہ بھی نہیں جانتا کہ اپنے قدموں پر کیسے کھڑا ہوا جاتا ہے۔ اچانک اس کا سر پھر جاتا ہے۔ اچانک وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ ایک بڑا آدمی ہے اور تو اور اس حد تک کہ یحییٰ خاں کے مارشل لاء کے زمانے میں کہیں ہارس شو لگا تو وہ جنرل ٹکا خاں کے پاس گیا جو وہاں موجود تھے۔ اور ان سے کہا "کیا تم جانتے ہو کہ میں قومی اسمبلی کا رکن ہوں۔ یہاں کئی بریگیڈیئر اور جنرل مجھ سے آگے بیٹھے ہوئے ہیں۔ حالانکہ میں ان سے برتر ہوں۔" یوں سب جرنلوں اور بریگیڈیئروں کو اُٹھ کر اس کے لیے آگے جگہ دینی پڑی تاکہ وہ اپنے رتبے سے منتخب ایم این اے کی حیثیت سے بیٹھ سکے۔ وہ بہت مغرور ہو گیا تھا اور پھر وہ جس طریقے سے پولیس افسروں کو گالیاں دیا کرتا تھا۔ ایک سینئر پولیس افسر میرے پاس آیا۔ اس نے مجھے بتایا جناب یہ درندہ جو انتخاب جیت گیا ہے۔ ہمیں گالیاں دیتا ہے۔ خدا کے لیے ہمیں اس کی گالیوں سے بچائیے۔ یہ تو ابھی ایک ایم این اے بنا ہے۔" تو جناب یہ شخص تھا جو اقتدار کا بھوکا تھا۔ اور میں جہاں تک ہو سکتا تھا اس کا تحفظ کرتا تھا۔ میں اقتدار کا بھوکا نہیں ہوں۔ اقتدار میرا بھوکا ہے۔

۲ مئی کو اس پر جو حملہ ہوا وہ اس کے مخالفوں اور دشمنوں نے اس پر کیا تھا۔ میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں اور نہ ہی ایف آئی آر میں میرا ذکر ہے۔ ایسا کوئی تاثر اس میں نہیں دیا گیا تھا۔ مجھے اسے معطل کر دینا چاہیے تھا۔ کیونکہ .... اصل میں یہ بات سرکاری وکیل نے کہی ہے۔ ایک بار نہیں کئی بار کہی ہے کہ یہ اونٹ کی کمر پر آخری تنکا تھا۔ آخری تنکا

یہ اونٹ فلوریڈا سے نہیں آیا، یہ اونٹ سندھ کے صحراؤں کا ہے۔ اس کی کمر پر کوئی تنکا نہیں ہے یہاں کسی آخری تنکے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کون سا آخری تنکا۔ وہ ہر شخص کے لیے ناقابل برداشت بن چکا ہے۔ میں آسانی سے محض اسے نکال کر معطل کر سکتا تھا۔ وہ سب چاہتے تھے کہ اسے باہر نکال کیا جائے۔ معزول کر دیا جائے۔ میں نے کہا میں اسے معطل کر دوں گا۔ اسے میں نے محض معطل کر دیا تھا۔

اس کے بعد مائی لارڈ، وہ کہتا ہے کہ اس کی پہلی وفاداری اپنے ملک کے ساتھ، پھر پارٹی کے ساتھ اور پھر رہنما کے ساتھ۔ اب آپ اس کی وفاداری کا جائزہ لیجیے۔ (میں اس کی راست گوئی کی بات کر رہا ہوں۔ ۱۹۷۰ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کا رکن بن گیا۔ اس نے ۱۹۶۷ء میں شرکت کی تھی۔ اسے معطل کر دیا گیا۔ ٹھیک ہے یہ اس کا قصور نہیں۔ پھر وہ پیپلز پارٹی چھوڑ دیتا ہے۔ اسے نکالا گیا یا باہر پھینکا گیا۔ جو بھی ہو وہ تحریک استقلال میں شامل ہو گیا۔ اس نے پاکستان پیپلز پارٹی میں ایک فارورڈ بلاک بنانے کی کوشش کی۔ اسے تحریک استقلال سے نکال پھینکا گیا۔ اس کے اصغر خاں کے ساتھ اختلافات تھے (ان کے لیے میں اس پر الزام نہیں دیتا) اس کے بعد وہ پھر پیپلز پارٹی میں شامل ہو گیا۔ اب یہی آدمی کہتا ہے کہ پہلے وہ ملک کا وفادار ہے۔ اس کے بعد پارٹی کا اور پھر لیڈر کا۔ اس ممتاز سیاسی کیریئر کے پانچ سے سات یا دس برسوں میں تین بار وہ پارٹیوں میں آیا اور گیا۔ یہ ہے اس کا تصور وفاداری۔

اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ اس نے ایک سٹریٹجک پلان بنایا (دراصل وہ کہنا یہ چاہتا تھا کہ ایک ٹیکنیکل پلان) بہرحال اس پر دھیان نہ دیجیے۔ اس نے ایک سٹریٹجک پلان بنایا۔ کس لیے؟ میں اس کے موقف کی کلیدی نکتے کی طرف آتا ہوں۔ کیونکہ مسٹر بھٹو صدر ہے اور کیونکہ مسٹر بھٹو چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر ہے۔ اس لیے وہ ابتدائی سماعت کی عدالتوں میں سزا دے سکتا ہے۔ یہ اس نے پتہ نہیں کہا کہ ہلاک کروا سکتا ہے۔

آج چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کون ہے جس نے اسے ورغلایا ہے؟ تو کیا یہی اس کا معیار ہے۔ یہی وہ بنیادیں ہیں جن کی وجہ سے وہ اپنے باپ کی موت کو بھول گیا۔ (کیونکہ اس نے سید احمد سے

لکھا کہ میں نے اس کے والد کے قاتلوں کیساتھ بہت تعاون کیا ہے ، ایسی صورت میں تو آپ اپنے والد کے قاتل کے ساتھ تعاون نہیں کر سکتے۔ پھر چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر ہی کیوں؟ یہ کلید ہے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کا وہ خوف ہے۔ جو اس آدمی کے ذہن پر سوار ہے۔ اور اب جبکہ اس کیس کی دوبارہ تحقیقات کی جا رہی ہیں تو اس کے لیے اس ملک میں ایک چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر موجود ہے۔ اس وقت اگر صرف ایک صدر ہوتا تو وہ ایک بار پھر" اپنے دانت دکھاتا" لیکن وہ اپنے دانت اس کے قول کے مطابق چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کو نہیں دکھا گیا۔ وہ اپنے ہی لفظوں کی بنا پر مورد الزام ٹھہرتا ہے۔

اس نے اس کیس کو نئے سرے سے اس لیے دوبارہ پیش کیا ہے کہ تین برسوں کے بعد پیش کیا ہے کہ یہاں ایک چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر موجود ہے۔ ٹھیک ہے اس نے ایک ٹیکنیکل فیصلہ کیا ہے۔ ایک پریکٹیکل حربے یا فیصلے سے یہ تو ممکن نہیں ہوتا کہ آپ وہوا ہی قلابازیاں بھی لگا سکیں ٹھیک ہے۔ تم تحریک قائد عوام میں پناہ حاصل کر سکتے ہو۔ وہ اس میں شریک ہو گیا۔ میں نہیں جانتا کہ وہ ایسا مبالغہ کیوں کر رہا ہے۔؟

اس کے بعد میکسکو جانے کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ اس نے مجھے ایک طویل رپورٹ بھیجی جس میں لکھا کہ آپ ایک مدبر ہیں۔ ایک عالم مدبر۔ پھر اس نے میری بیوی کو دعوت دی (اور بے شک اب وہ کہہ سکتا ہے کہ وہ خود اس کے پاس گئی تھی) بہر حال اگر وہ ایسا کہتا ہے تو اسے کہنے دو۔ حالانکہ وہ ہر وقت اسے دعوت دیتا اور گڑگڑاتا رہتا تھا۔ اس کے استقبال میں اس نے بیان دیا کہ اس کی بہن آئی ہے۔ جس نے اس کے ہاں آکر اس کی عزت میں اضافہ کیا ہے۔ یہ اس کا اپنا گھر ہے۔ اگر تم نے کوئی چال چلنے کا منصوبہ بنایا ہی تھا تو بھی تمہیں ایک باوقار انسان کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ اپنی عزت خود کرنی چاہیے۔ اپنی کھال بچاؤ اور آکر پچھلی نشستوں پر بیٹھ کر اپنی حاضری کا ثبوت دو۔ لیکن یہ مبالغہ اور فریب کیوں؟ کیا اس طرح تم اپنی وفاداری کا ثبوت پیش کر رہے تھے؟ اس نے کہا ہے کہ اس نے یہ سب کچھ مجھے دھوکا دینے کے لیے کیا تھا۔ لیکن میں ایسا سادہ اور بے وقوف نہیں ہوں۔ مجھے رپورٹیں مل رہی تھیں کہ وہ انتقام لینا چاہتا ہے میں تب بھی اسے جانتا تھا۔

وہ کہتا ہے کہ اس نے اس لیے میرے ساتھ صلح کر لی تھی کیونکہ میں سی ایم ایل اے بن گیا تھا اور میں کہتا ہوں کہ یہی وہ سبب ہے جس کی بنا پر وہ اس مقدمے کو دوبارہ میرے خلاف گھسیٹ لایا ہے۔ کیونکہ آج بھی ایک سی ایم ایل اے موجود ہے۔

اور پھر مائی لارڈ، دوسرا حملہ، ملور کے حوالے سے، ہونے والی فائرنگ، جرح کا معاملہ ہے۔ اس کے خلاف ایک مقدمہ درج ہے کہ اس نے یہ فائرنگ کرنے کے بعد ملور بھاگا اور روپوش ہو گیا اور قصوری نے پولیس سے کہا کہ اسے جبراً باہر لایا جائے۔ یہ دوسرا انداز ہے اس طرح وہ اپنا بوجھ دوسرے لوگوں کے خلاف ڈال دیتا ہے۔ یہ مقدمہ اب بھی مجسٹریٹ کی عدالت میں زیر التوا ہے۔ چلیے یونہی سہی مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر میں اس کا خون کرنے کے پیچھے پڑا ہی ہوا ہوں، جیسا کہ وہ دعوے اکرتا ہے کہ تو پھر اس کے بھائی خضر حیات کو ایک سوزخم کیسے آئے؟ خضر کے خلاف تو میرے پاس کچھ نہیں۔ پھر خضر کو سو زخم کیسے آئے؟ قصوری نے کہا ہے سو زخم؛ اس پر حملے کرنے والے کیا ایسے ہی تھے کہ اس پر بار بار وار کرنے اور زخمی کرنے کے بعد بھی اس کی شناخت نہ کر سکے۔ انہوں نے ضرور دیکھا ہو گا کہ یہ احمد رضا قصوری نہیں ہے۔ یہ خضر ہے۔ خاندانی دشمنیاں ہوتی ہیں۔ یہ بھی ایک مقامی دشمنی ہو گی۔ بھلا میں ایسا کیوں کرتا؟ چلیے احمد رضا قصوری ٹھیک ہے لیکن خضر کیوں؟

اب، مائی لارڈ اسی قصوری کو چانسلر کے حکم سے گورنمنٹ کالج سے نکالا گیا تھا۔ اسے ایک سر اپھرا ہونے کی وجہ سے گورنمنٹ کالج سے نکال دیا گیا تھا۔ اسے گورنمنٹ کالج سے باہر پھینک دیا گیا۔ اسے نواب کالا باغ نے گورنمنٹ کالج سے نکال دیا۔ جو ایک بہت اچھا منتظم تھا۔ اور پھر یہی نہیں اسے ترکی پاکستان ایسوسی ایشن سے بھی نکال دیا گیا اسے تحریک استقلال سے باہر پھینک دیا گیا۔

تو یہ ہے استغاثہ کے مرکزی گواہ کا مزاج، کردار اور رویّہ۔ اس کی ان باتوں میں تضادات ہیں اس نے خود مارشل لا کی دہشت اور ڈر کا اعتراف کیا ہے۔ وہ مارشل لا سے خوفزدہ ہے وہ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر سے خوفزدہ ہے۔

یہ کتنی حیران کن بات ہے کہ اسے یہ یاد نہیں کہ وہ پہلی بار مجھے کب ملا تھا وہ پہلی بار مجھے اس

وقت ملا۔ جب میں نے وزارت خارجہ کو چھوڑا تھا۔ لاہور میں میرا شاندار اور بہت بڑا استقبال کیا گیا۔ یہ وہاں تصویریں اتار رہا تھا۔ میں نے اسے نہیں دیکھا۔ میں لوگوں کے ہجوم میں تھا۔ اس کے بعد میں نواب کالا باغ کے ہاں چلا گیا۔ اس نے مجھے دوپہر کے کھانے پر مدعو کر رکھا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد میں فلیٹیز چلا گیا۔ جہاں میرا قیام تھا۔ وہاں چاروں طرف لوگوں کے ہجوم تھے۔ ایک آدمی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ "میں آپ کا محافظ بنوں گا۔ میں آپ کا پیروکار بنوں گا۔ میں آپ کے لیے اپنی زندگی دیدوں گا۔" وہ اپنی آواز کی پوری بلندی سے چیخ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا تمہارا نام کیا ہے۔" اس نے جواب دیا "میرا نام ... میں تو آپ کا رشتہ دار ہوں۔" میں نے اس سے پوچھا "تم کس طرح میرے رشتے دار ہو۔" وہ کہنے لگا۔ آپ کے بہنوئی 'نسیم الاسلام جو بدر الاسلام کے صاحبزادے ہیں ان کی والدہ اور میری والدہ رشتے دار ہیں، میں نے کہا بہت دور کی بات ہے۔ بہت دور کی بات ہے '۔

اور وہ کہتا ہے ' میں نہیں جانتا کہ وہ کب مجھے ملا۔ میں نہیں جانتا پہلی ملاقات کب ہوئی '۔ حالانکہ یہ وہی تھا جو آکر میری اس طرح خوشامد کر رہا تھا۔ باتیں کر رہا تھا۔ یورلارڈشپس وہ میرا محافظ چوکیدار بننا چاہتا تھا۔ وہ خوشامدی اور کاسہ لیس اور اندرونی حلقے کا چغل خور بننا چاہتا تھا۔ وہ سیاسی درجے میں شریک ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اگر اسے کبھی اس اندرونی حلقے میں شامل ہونے کا موقع مل جاتا تو وہ اسے خوشامدیوں کا حلقہ قرار دیتا۔ لیکن اسے کوئی دوسرا نام نہ دیتا۔

اس آدمی کا کوئی 'رتبہ یا قدر و منزلت نہیں تھی۔ جیسے کہ جنرل ضیا نے کیہان انٹرنیشنل میں اپنے انٹرویو میں کہا ہے۔ تہران کے اخبار "کیہان انٹرنیشنل" کو خود جنرل ضیا نے کہا "قصوری کچھ بھی نہیں۔" لیکن یہ بات بہت گھٹیا ہے کہ مسٹر بھٹو اتنا نیچے جھک گئے کہ ایک نامعلوم حقیر شخص کے قتل کا اہتمام کیا۔

اب مجھے اجازت دیجیے کہ میں بات آگے بڑھاؤں۔ کیا مسٹر بھٹو نے کسی ایسے شخص کو قتل کرانے کی کوشش کی جو مسٹر بھٹو جیسا تھا۔ میں ایسی قوتوں کو جانتا ہوں جو ایسا کام کرنے

پر مجبور ہوئیں۔" کیونکہ مسٹر بھٹو طاقتور ترقی پسند قوتوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس لیے رجعت پسند طاقتیں ان کا صفایا کرنا پسند کرتیں۔ اگر میرا صفایا ہو جاتا تو وہ بات سمجھ سکتے تھے۔ اس سے کچھ مقصد پورا ہوتا۔ کسی طبقے کا مفاد، بورژوا طبقے، سرمایہ دار طبقے، ۲۲ خاندانوں کا مفاد، تب وہ قتل کی وجہ سمجھ گئے۔

قصوری نے اپنے نکتے کو خود ہی ثابت کر دیا۔ جب اس پوچھا گیا کہ اس نے ایف آئی آر میں مسٹر بھٹو کا نام کیوں شامل کرایا۔" اس نے جواب دیا "یہ میرا اسٹائل ہے۔" تو اب مجھے ایک سٹائل کے اظہار کے لیے قتل کے ایک مقدمے میں پھنسا دیا گیا۔ یوں پھنسانا اس کا سٹائل ہے جب اس سے دوسرے واقعات اور حادثوں کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا۔ میں اپنی سکریپ بک دے چکا ہوں۔ جب اس سے کوئی ٹھوس اور قابل قبول شہادت دینے کے لیے کہا گیا تو اس نے قومی اسمبلی کی تمام جلدوں کو پھینکتے ہوئے کہا۔

"میں نے انہیں قومی اسمبلی کی تمام جلدیں دے دی ہیں۔" یہ بات کرنے، تشریح کرنے کا کوئی طریقہ نہیں۔ آپ سے ایک خاص سوال پوچھا جاتا ہے۔ یہ ایک فوجداری مقدمہ ہے۔ یہ قتل کا مقدمہ ہے۔ اور وہ جواب دیتا ہے ہاں میں مطمئن ہوں۔ ایک جگہ وہ کہتا ہے۔ یہ میرا سٹائل ہے۔ ایک جگہ وہ کہتا ہے میں نے سکریپ بک دے دی اور تیسرے کیس میں وہ کہتا ہے۔ میں انہیں اسمبلی کی تمام جلدیں دے دی ہیں۔

سب سے برتر اور اولیں بات یہ ہے کہ اس شخص کے خلاف میرے پاس جو کوئی محرک، کوئی "جواز"، کوئی وجہ نہیں ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس کا باپ مارا گیا۔ جب راؤ رشید نے مجھے فون پر بتایا میرا پہلا ردعمل تھا۔ "کیوں یہ کیسے ہوا" اس طرح کا ردعمل تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ کار میں دو آدمی بیٹھے ہیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ محمد خان قصوری ہلاک ہو گیا ہے۔ کیوں؟ یہ کیسے ہوا، کچھ ایسا ہی میرا فوری ردعمل تھا۔ مجھے افسوس ہوا۔ میں نہیں جانتا کہ آخر میں اسے یا قصوری کو کیوں قتل کراتا؟ میں اس کے قیاسی نتائج میں نہیں جانا چاہتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آخر میں قصوری کو کیوں قتل کراتا؟

سیاسی دشمنی میں میری سطح بہت اونچی ہے۔ سیاسی مخالفتوں اور سیاسی اختلافات میں میرا

انداز بہت بلند ہے۔ جب یہ قومی سطح پر ہوں تو انتہائی بلند قومی سطح پر ہوتے ہیں۔ جب یہ بین الاقوامی سطح پر ہوں تو انتہائی بین الاقوامی بلندی پر ہوتے ہیں۔ میں کبھی چھوٹی چیزوں، چھوٹی لڑائیوں اور چھوٹی چیزوں اور چھوٹے جھگڑوں میں نہیں پڑا۔ اگر اس نوعیت کی ترجیحات میرے پاس نہ ہوتیں تو میں ۱۹۵۲ء میں آکسفورڈ کی تعلیم کے بعد اپنے ملک واپس نہ آتا اور پہلا منتخب صدر ۱۹۷۰ء میں نہ بنایا جاتا۔

میں نے اس لڑکے کی خدمت کرنے کی کوشش کی یقین کیجیے میں نے ہمیشہ اس کی بھلائی کی کوشش کی جیسے میں نے بہت سے دوسرے افراد کی تربیت کی۔ میں چاہتا ہوں کہ انصاف پورا کیا جائے نہ آپ نے کیا کیا ہے۔ میرا نام کیوں شامل کیا ہے۔؟ آپ نے اسے سیاسی صورت میں کرنے کی اجازت کیوں دی؟ جب ان لوگوں کا وقت آیا تو میں نے ان کو ترقی دی۔ ان سب کو، کسی ایک کو نہیں جانتا۔ اپنی تمام تر جھوٹی گواہیوں کے باوجود ان میں سے کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا کہ میں ان کے پاس گیا یا ان سے ملا۔ میں نے احمد سے کہا۔ اور نہیں جانتا کہ احمد کون ہے! میں یہ بھی نہیں جانتا کہ ملک وارث کون ہے۔ سعید احمد نوٹس بھیجا کرتا تھا۔ میرا کمرہ ان نوٹسوں سے بھرا رہتا تھا۔ میں صوبوں کے متعلق معلومات چاہتا تھا۔ یہ جاننا چاہتا تھا کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ مزدوروں کے بارے میں اور ہر چیز کے بارے میں۔ میں ہر وقت سفر میں رہتا، مختلف جگہوں پر جاتا۔ جلسوں میں تقریریں کرتا۔ عوام سے رابطہ قائم کرتا۔ عوام کے دکھ درد سنتا۔ عوام کو متحرک کرتا۔ حوصلے دیتا۔ میں خبروں سے واقف ہوتا۔ بین الاقوامی حالات سے باخبر رہتا۔ ہر طرح کے امور اور معاملات میں مصروف رہتا۔ میں حقیقی معنوں میں دن رات کام کرتا تھا۔ تو پھر میں اپنے آپ کو ایک قتل میں کیوں ملوث کرتا۔؟

ایسا کرنے کا میرے پاس کوئی جواز نہیں تھا۔ ان شہادتوں کے اعتبار سے بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ اس لڑکے کو قتل کرانے کا میرے پاس کوئی جواز تھا۔ میں اب بھی اس کی خیر خواہی چاہتا ہوں۔ جہاں تک محرک اور جواز کا تعلق ہے۔ یہ لایعنی اور ناقابل یقین ہے۔ اس نے اپنے آپ سے جھوٹ بولا ہے۔ مائی لارڈز، وہ حربوں اور چالاکیوں کے منصوبوں کی بات کرتا اور دانت بدلتا رہتا ہے۔ میں نے اس کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ آپ کو پوری صداقت سے بتاتا ہوں کہ یہ چیز

واقعی ایک انتہائی دلچسپ کہانی ہے اور اس اعتبار سے میں اس کا شکر گزار ہوں کہ یہ اتنی دلچسپ ہے کہ میں ہنستے ہنستے مر گیا ہوں۔

ایک مرحلے پر یور لارڈ شپ نے بجا فرمایا ہے کہ فرض کیجیے کہ مقدمہ پوری طرح قائم ہو جاتا ہے اور اس میں سیاسی تعصبات کی ملاوٹ شامل نہیں ہوگی۔ کیونکہ ہم اسے اس کے میرٹ پر ہی فیصلہ کریں گے۔ مائی لارڈ کیا یہ سوچا بھی جا سکتا ہے کہ ایک جھوٹا اور غلط مقدمہ ہی ایک مکمل کیس ہو سکتا ہے! یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ ایسا واقعہ ہوا۔ جعلی اور جھوٹے مقدمے بھی تو مکمل اور سچے مقدمات بنا دیے جاتے ہیں۔ میں کرسٹی کے ناولوں کی بات نہیں کر رہا۔ میں لاء رپورٹوں کا ذکر کر رہا ہوں۔

خدا کا شکر ہے.... اشتیاق کے وفور میں، اپنی عجلت اور جلد بازی میں، بھٹو کے خلاف ان کے زہریلے پن نے کہ بھٹو جیسا ایک شخص اس طرح سے ختم کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ وہ ترقی پسند طاقتوں کا نمائندہ ہے۔ اپنی عجلت میں اس اشتیاق اور وفور میں اس طرح شکار میں پکڑو مسعود محمود کو لاؤ، اسے لاؤ اور اسے لاؤ۔ ان کا اشتیاق، ان کا میرے خلاف اور ان کی ناتجربہ کاریاں..... اسے جانے دو، پکڑو... جانے نہ دو..... اگر تین یا چار انتہائی ذہین عقل و ہوش کے ساتھ ایک کمرے میں جمع نہ ہو پاتے تو مائی گاڈ۔ یہ مجھے ختم کر چکے ہوتے۔ یہ ایک جھوٹے کیس کو، مارشل کے تحت سچا کیس بنا کر دکھا دیتے۔ خدا نے مجھے بچایا ہے۔ خدا میرے تحفظ کے لیے آیا ہے۔

گزشتہ روز میں نے دیکھا کہ آپ کے خیالات خواہ کچھ بھی ہوں۔ آپ نے مجھے سنا۔ میں جج نہیں ہوں۔ میں یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ آپ کے ذہنوں میں کیا ہے۔ لیکن معروضی طور پر میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ آپ بڑے تحمل سے مجھے سن رہے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ کم از کم مجھے سنا تو گیا ایک سال کے بعد کم از کم مجھے کچھ کہنے کی اجازت تو دی گئی۔ ہم بڑے جذباتی لوگ ہیں۔ اب جبکہ آپ مجھ پر یہ عنایت کر چکے ہیں میرے اس حق کو دے چکے ہیں کہ میں بولوں اور سنا جاؤں تو آپ مجھے پھانسی پر بھی لٹکا سکتے ہیں۔ لیکن اس شخص کو قتل کرنے کی میرے پاس کوئی وجہ نہیں۔ یا اسے جو قتل ہو گیا۔ میری لڑائی تو بڑے لوگوں اور بڑے مسائل سے ہے۔

تیسرا دن

مسعود محمود کی شہادت پر

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو:۔ استغاثہ کے گواہ نمبر ۲ نے مسعود محمود نے دعوے کیا ہے کہ میں نے اسے کہا کہ وہ وقار کے داہنے ساتھ رہے۔ مگر اس میں کیا نکتہ ہے کہ میں نے اسے وقار کے دائیں ہاتھ ساتھ رہنے کے لیے کہا یہ تمام سرکاری ملازم ہیں۔ وہ اپنے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایسا بھی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ مسٹر وقار داہنے ہاتھ بن کر رہیں۔

میں نے یہ واضح کر دیا ہے کہ اس کی تقرری کے وقت جو ملاقات ہوئی وہ ایک روایتی ملاقات تھی۔ اس نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے وہ اس لیے ایسا کر رہا ہے کہ احمد رضا قصوری کی پیمبرانہ بصیرت اور ایف ایس ایف کے ساتھ مطابقت پیدا کر سکے۔ مسعود محمود نے کہا ہے کہ میں نے اسے بعض ملاقاتوں میں کہا کہ وہ ہجوم کو نگل جائے اور اپوزیشن کے جلسوں کو توڑ کر رکھ دے۔ ایسی بات اس نے اپنے اوریجنل بیان میں نہیں کہی۔ بلکہ اس کے برعکس اس میں ایف ایس ایف کا چارٹر اور اس کا فنکشن پیش کیا۔ اس میں اس نے جو بیان دیے ان میں اس نے احمد رضا قصوری نے جو کچھ کیا ہے۔ اس کے ساتھ مناکحت کی ہے۔ یہ شادی اتنی کامیاب رہی کہ اس نے تقریباً وہی الفاظ دہرا دیے جو احمد رضا قصوری نے استعمال کیے تھے۔ مسعود محمود نے یہ ترقی اور تبدیلی عدالت میں ان تمیز نام نہاد زبانی ہدایات کی بنا پر کی جو میں نے اسے دی تھیں۔ جب اس سے ہائی کورٹ میں مزید سوال کئے گئے جو راولپنڈی کے جلسے کے متعلق تھے تو وہ ہجوم

جسامت بتانے کے علم سے انکاری تھا۔ اس نے کہا "مجھے یاد نہیں" جبکہ ہر شخص یہ جانتا ہے اور اس کی تصدیق کر سکتا ہے کہ وہاں کم از کم ۲ لاکھ افراد اس جلسے میں تھے۔ مسعود محمود کا بیان ہے کہ وہاں ایف ایس ایف کی ایک ہزار نفری موجود تھی۔ اب یہ بتایئے کہ ایک ہزار کی نفری دو لاکھ کے ہجوم کو کس طرح نگل سکتی ہے۔ یہاں بھی اس نے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ ایک قابل اعتماد گواہ نہیں ہے۔

مسعود محمود کہتا ہے کہ وزیر اعظم اکثر مجھے بلواتے تھے اور ٹیلی فون پر بات چیت کرتے تھے۔ آپ صحیح طور پر یہ طے نہیں کر سکتے کہ یہاں "اکثر" کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ بنیادی طور پر یہ ایک موضوعی رائے ہے۔ اس وقت تک، جبکہ ایسا ہر روز ہو رہا ہو۔ لیکن وہ کہتا ہے اکثر۔ "وقتاً فوقتاً"..... اگر میں اس سے اکثر ملتا تھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ روزانہ ملاقات ہوتی تھی۔ ایسی صورت میں مجھے سعید احمد سے یہ کہنے کی ضرورت پیش نہ آ سکتی کہ وہ میرا پیغام مسعود محمود تک پہنچا دے۔

مائی لارڈ، قصوری کی ۳ جون والی تقریر، مسعود محمود ۳ جون والی تقریر پر تفصیل سے بات کرتا ہے۔ اس نے ہائی کورٹ میں کہا کہ میں نے اسے کہا کہ میں اب مسٹر قصوری کے بھیانک اور شرمناک رویئے سے بالکل تنگ آ گیا ہوں اور میاں عباس کی حرکتوں سے پوری طرح آگاہ ہے۔ وہ کہتا ہے "وزیر اعظم نے مجھے مزید بتایا وہ اس سلسلے میں پہلے سے ہدایات دے چکے ہیں۔ مائی لارڈ، یہ ایک اہم بنیادی باتوں میں سے ایک ہے۔ جس کا ذکر اس نے اپنے پہلے بیانوں میں نہیں کیا۔ اس نے یہ بات نہ ۲۴ اگست کو کہی نہ ۱۴ ستمبر کو ہی اس کا ذکر کیا اور یہ ایک بہت اہم بیان ہے۔ اس بیان کو آسانی سے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اس وقت وہ اوریجنل بیان دے رہا تھا۔ عدالت میں اس نے اپنے بیان میں اضافہ کر لیا۔ یہ کہتے ہوئے کہ ۳ جون کی تقریر کے فوری بعد دو دنوں کے بعد اسے بلایا اور کہا کہ اس کے پیشرو کو اس سے پہلے ہی ہدایات دی جا چکی ہیں اور میں قصوری کو ٹکڑوں میں بندھا ہوا یا مردہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ مسعود محمود نے اپنے اولیں بیانات میں ایسی کوئی بات نہیں کہی۔

مسعود محمود حراست میں تھا۔ اسے ایک سوالنامہ دیا گیا۔ اس سوالنامے کے علاوہ اسے بتایا گیا تھا کہ مارشل لا کی سپرد داری میں چالیس دن رہتے ہوئے، وہ جو چاہے کہہ سکتا ہے اسے ۵ رجولائی کو گرفتار کیا گیا تھا۔ وہی وقت جب ہمیں گرفتار کیا گیا تھا۔ چالیس دنوں کے بعد اگست میں، مجھے یاد پڑتا ہے۔ ۱۳ یا ۱۴ ر اگست کو اس نے اپنا بیان دیا۔ یہی نہیں بلکہ اسنے ایک سٹینو گرافر کی خدمات بھی حاصل کیں۔ میرا خیال نہیں ہے کہ مجھے کسی سٹینو گرافر کی خدمات حاصل کرنے کی اجازت دی جاتی۔ جب کہ میں آنریبل عدالت کے سامنے پیش ہونے والا تھا۔ میرے حالات اور ماحول کو دیکھتے ہوئے مجھے سٹینو گرافر کی ضرورت تھی۔ لیکن اگر میں کہتا تو مجھے اس کی اجازت نہ تھی) اس نے سٹینو گرافر طلب کیا۔ اس نے عبدالحق کے لیے کہا۔ جسے وہ اپنے ساتھ لندن لے گیا تھا جو اس کا پسندیدہ افسر تھا اور اسے عبدالحق دے دیا گیا۔ وہ آدمی جس نے اس کے اور حکام کے درمیان خاص کردار ادا کیا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اسے ذہنی سکون حاصل ہو گیا۔ کیونکہ تمام ذمے داریوں سے اسے چھٹکارا مل گیا تھا۔ وہ تمام ذمے داریاں تناؤ اور کھنچاؤ جن کی تکلیف وہ برداشت کر رہا تھا۔ اسے دنیا میں پورا وقت حاصل تھا۔ اس کا اپنا سٹینو گرافر دے دیا گیا۔ اسے اس کا چہیتا عبدالحق مل گیا۔ اس کے باوجود اہم نکات کے ٹھوس پہلوؤں کو اس نے چھوڑ دیا۔ اپنے دونوں بیانوں اگست اور ستمبر میں اسے یاد نہ رہے اس آنریبل بنچ کے ایک جج نے بجا طور پر فرمایا کہ وہ تحقیقات کرنے والے حکام کو سیر پر لیے جا رہا ہے۔ وہ انہیں سیر پہ لے گئے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ایک خاص مقصد کے لیے انہیں سیر پر لیجایا گیا۔ وہ جانتا ہے کہ کس طرح ڈھنگ کے رنگ بدلتے ہیں۔ میں نے جو کیا ہے، اس کے برعکس میرا بیان دیکھیے۔" میں نے خدمت کی ہے۔

واقعتاً وہ انہیں سیر کرانے ہی لے گیا۔ وہ ہائی کورٹ آیا تو پوری طرح جانتا تھا کہ ہائی کورٹ اسے ایک ترمیم سمجھتے ہوئے غور کرے گی۔

اس اعتراف اور اس کا بیان جو اس نے ایک تصدیق کنندہ کی حیثیت سے دیا تو یہ مکمل ہے اور نہ یہ پوری وضاحت کرتا ہے۔ اس خامی کی وجہ سے یہ بیان ناکام ہو جاتے ہیں۔ بلاشبہ غلام حسین کا بیان اس سے بھی بدتر ہے۔ غلام حسین نے تسلیم کیا کہ وہ پوری تفصیلات کو نہیں

کو نہیں جانتا۔ پھر بھی یہ اس کی فریب کاری تھی۔ کیونکہ میاں عباس نے اسے کہا تھا کہ میری کھال بچاؤ۔ غلام حسین کہتا ہے کہ میں نے وہاں جھوٹ بولا اور اب ہائی کورٹ میں میں بھرپور اور مکمل بیان دے رہا ہوں۔ یہی خامی اور جھوٹ تصدیق کنندہ نمبر ایک پر بھی اطلاق کرتی ہے گواہ نمبر ایک اور گواہ نمبر دو نے اپنا ہی بطلان کیا ہے وہ جھوٹے ہیں انہوں نے خود تسلیم کیا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔ ایک مرحلے پر مسٹر جسٹس صفدر شاہ نے ان سے پوچھا کہ وہ اپنا پورا اور مکمل بیان کب دیں گے۔ کہا گیا کہ وہ بحث کے درمیان اسے ظاہر کریں گے۔ یا پھر یہ ظاہر ہوا کہ جونہی موقع ملا وہ اس کا اظہار کریں گے۔ اب آپ مکمل بیان کے لیے کسی خاص وقت کا انتخاب نہیں کر سکتے۔ یہ اس ملک کا قانون نہیں ہے۔

پورا مکمل بیان آپ کو کم از کم ضرور دینا چاہیے۔ جب آپ کو معاف کر دیا گیا ہو۔ اس کے باوجود اس نے پورا اور مکمل بیان نہیں دیا۔ وہ اِدھر اُدھر کی ہانکتا رہا۔ اس نے اس مقدمے کی حدود میں بات ہی نہیں کی۔ مسعود محمود نے خود ہائی کورٹ میں یہ کہا کہ اس کے پہلے دونوں بیان درست نہیں ہیں۔

مائی لارڈ اس واسطے سے آپ اس جھوٹ اور فریب کو بھی سمجھ سکتے ہیں جو ویلش کی باتوں کے حوالے سے کہا گیا۔ اس کی دروغ گوئی کی کوئی انتہا نہیں پہلے اس نے کہا اس نے ویلش سے راولپنڈی میں بات کی پھر اس میں تبدیلی کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ان سے کہا نہیں نہیں۔ میں نے اسے یہ بات کوئٹہ میں کہی۔ مائی لارڈ آپ دیکھ چکے ہیں کہ اس نے اسلام آباد کے حادثے کے بارے میں مکمل لاعلمی کا اظہار کیا۔ اصل نکتہ یہ ہے کہ اگر اس آدمی کو یہ کام سونپا گیا تھا تو وہ اسلام آباد کے حادثے کے بارے میں کیوں نہیں جانتا یہ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ اسلام آباد اور لاہور کے واقعات کے درمیان جو تعلق ہے وہ اس سے بے خبر تھا۔ وہ یہ کیوں نہیں جانتا کہ اسلام آباد کے حادثے پر کسے متعین کیا گیا تھا اور اسلام آباد کے حادثے میں کیسا ایمونیشن اور اسلحہ استعمال میں لایا گیا تھا۔ ایک آدمی کہتا ہے کہ جیپ سبز تھی۔ وہ مکمل لاعلمی کا اظہار کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ اسے یہ بات سوجھی تھی۔

مائی لارڈ آپ محض سچائی دینے پر فیصلہ نہیں کر سکتے۔ یہ ایک بے حد ذاتی اظہار ہوتا

مجھے سجھائی دیتا ہے میں چھٹی حس رکھتا ہوں۔ میں پیشین گوئی کر سکتا ہوں ان باتوں سے کوئی گواہی تشکیل نہیں پا سکتی۔ مسعود محمود نہ صرف اسلام آباد ہی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا بلکہ وہ غلام حسین سے بھی قطعی ناواقف ہے۔ اس کے باوجود یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ اس کے کمرے کے باہر سرخ روشنی دکھائی دے رہی تھی اور وہ غلام حسین کے ساتھ بہت دیر تک رہا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ وہ غلام حسین کو نہیں جانتا تھا جو اصل منصوبہ ساز اور تمام معاملے کا قاتل اور جو اس کا مرکزی کردار ہے جو اس جرم کی تکمیل کے لیے جا رہا تھا ایسے شخص کو مسعود محمود نہیں جانتا تھا۔ وہ بار بار کہتا ہے کہ وہ انسپکٹر غلام حسین اور دوسرے تمام اقبالی ملزموں کو نہیں جانتا۔ اگرچہ یہ بات ریکارڈ پر آ چکی ہے کہ ان میں سے ایک اس کا ذاتی محافظ تھا۔ غلام حسین نے کہا ہے کہ ایک عرصے تک اس کی ڈیوٹی خصوصی اسمبلی میں لگی رہی۔ مسعود محمود کہتا ہے کہ میں جب بھی قومی اسمبلی گیا اور میں اکثر جاتا رہتا تھا تو وہ ہمیشہ وہاں ہوتا تھا۔ اس پر بھی وہ کہتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو نہیں جانتے۔

وہ غلام حسین کو نہیں جانتا اقبالی ملزموں سے کسی ایک کو نہیں جانتا یہ وہ نکتہ ہے جسے بڑے موثر انداز میں اسے معزز عدالت نے خود اٹھایا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر وہ کیا جانتا تھا۔ اسے کون سا کام سپرد کیا گیا تھا۔ وہ اس منصوبے کو بھی نہیں جانتا تھا۔ جس میں وہ خود شریک تھا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ آخر کار تم اس منصوبے کے بارے میں کوئی موہوم سا اندازہ تو رکھتے ہو گے تو کہتا ہے کہ اس کے خیال میں کوئی منصوبہ نہیں تھا۔ وہ یہ کہتا ہے کہ اسے میں نے یہ کہا کہ وہ جائے اور میاں عباس کو یاد کرا دے اور یہ ہے وہ کام جو اسے سونپا گیا تھا۔

مسعود محمود کہتا ہے اسے حکم دیا گیا کہ وہ جائے اور میاں عباس کو بتا دے جسے وہ مکمل طور پر باخبر پاتا ہے۔ میاں عباس اسے بتاتا ہے کہ یہ معاملہ اس کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ کنٹرول میں ہے۔ میں اس کی دیکھ بھال کر رہا ہوں آپ اس کے بارے میں پریشان نہ ہوں۔ ایف ایس ایف کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے مسعود محمود پر قانونی اور خصوصی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس معاملے سے آگاہ ہوتا۔ وہ اپنے آپ کو بہت

دیندار آدمی کہتا ہے ۔ خدا سے ڈرنے والا ۔ وہ مجھے بتاتا ہیں خدا سے خوف کھانے والا ایک آدمی ہوں اور یہ کام نہیں کر سکتا

اس کے بیان کے مطابق میں نے اسے ڈرایا دھمکایا ۔ میں مشتعل ہو گیا یا بہت اونچی آواز میں اسے کچھ کہا ۔ مائی لارڈ یہ سب جھوٹ اور فرضی باتیں ہیں ۔ اگر وہ کسی مجرمانہ سازش میں شریک کیا جا رہا تھا تو اس کے لیے امنصوبے کے بارے میں پہلے سے کچھ نہ کچھ جاننا ناگزیر تھا کہ ہونے والا ہے خاص طور پر اس لیے کہ وہ ایف ایس ایف کا سربراہ بھی تھا ۔ لیکن نہیں اس معاملے میں وہ بے نیاز ہے ۔ لاپرواہ ہے ۔ وہ یہ زحمت گوارا ہی نہیں کرتا کہ منصوبے کے بارے میں کچھ معلوم کرے اس کے باوجود اسے اس سازش میں مرکزی رابطہ بنایا گیا ہے ۔

آیئے اب ہم اس حادثے پر بات کرتے ہیں ۔ لاہور کا حادثہ ۔ مسعود محمود ملتان کے ایک ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرا ہوا ہے ۔ ایک کینال ریسٹ ہاؤس میں اور میں صادق حسین قریشی کے ساتھ ٹھہرا ہوا ہوں ۔ وائٹ ہاؤس ملتان میں مسعود محمود کہتا ہے کہ میں نے اسے ساڑھے چھ بجے فون کیا ۔ جناب والا یہ بھی اس نے بات میں اضافہ کیا ہے ۔ یہ بات اہم نکتہ ہے کہ اگر وہ اپنے ابتدائی بیانوں کی تمام باتیں فراموش کر چکا ہے تو اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں کہ وہ یہ بھول جائے جیسا کہ وہ کہتا ہے کہ میں نے ساڑھے چھ بجے اسے فون کیا ۔ ساڑھے چھ بجے صبح اور میں نے اس سے بات چیت بڑی رنگینیٔ زبان میں کی پہلی بات تو یہ ہے کہ میں ہیڈکوارٹر میں نہیں تھا ۔ اور نہ ہی وہاں ڈائریکٹ ٹیلی فون تھا اور نہ ہی مجھے یہ معلوم تھا کہ یہ شخص کہاں ٹھہرا ہوا ہے ۔ اور پھر ذرا صبح ساڑھے چھ بجے کا وقت بھی ذہن میں رکھیے ۔ میرے اے ڈی سی اور دوسرے لوگ صبح آٹھ بجے یا اس کے قریب آئے ۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر میں ساڑھے چھ بجے جاگ رہا ہوں تو یہ نتیجہ ہے میرے اس رات بھر کے کام کا جس نے صبح ساڑھے چھ بجے تک مصروف اور جگائے رکھا ۔ یہ نہیں ہے کہ میں صبح ساڑھے چھ بجے جاگ جاتا ہوں ایسا کئی بار ہوا کہ میں ساری رات کام کرتے ہوئے ساڑھے چھ سات آٹھ اور نو بجے تک جاگتا رہا اور پھر سونے چلا گیا میں اتنا غیر مہذب آدمی نہیں ہوں کہ صبح ساڑھے بجے جاگ جاؤں اس کا

تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ راؤ خورشید نے سپریم کورٹ میں اپنا جو بیان حلفی داخل کیا ہے اس سے یہ سلسلہ ملانے کی کوشش کی گئی ہے۔ راؤ رشید نے اپنے بیان میں کہا ہے میں نے وزیر اعظم کو ساڑھے آٹھ بجے فون کیا۔ اے ڈی سی نے مجھے بتایا کہ میں ایک گھنٹے کے بعد ساڑھے نو بجے فون کروں۔ راؤ رشید بھی ملتان میں تھے۔ کیونکہ وہ اس وقت آئی جی پولیس تھے کیونکہ میں ملتان میں تھا اس لیے وہ بھی ملتان میں تھے۔ حقیقی صورت یہ ہے کہ یہ راؤ راشید تھے جنہوں نے سب سے پہلے مجھے لاہور سے اس حادثے سے آگاہ کیا۔ مسعود محمود کہتا ہے کہ میں نے اسے نو بجے فون کیا تھا۔ میں نے اسے ساڑھے نو بجے صادق قریشی کی موجودگی میں بلوایا اور کہا کہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ وغیرہ وغیرہ .....

سوال پیدا ہوتا ہے کہ میں اسے ساڑھے نو بجے یہ بتانے کے لیے کیوں بلواتا اور میں اسے کس طرح فون کرتا جبکہ میں آپ کو وجوہات بتا چکا ہوں کہ میرے لیے فون کرنا ممکن نہ تھا اور پھر اسے اوپن لائن پر سب کچھ کہتا۔ مائی لارڈ فرض کیجیے، کہ میرے پاس عام کھلا فون ہے۔ تب بھی میں اسے عام فون پر یہ سب کچھ کیوں بتاتا جبکہ میں اپنے وزیروں کو ہدایت دے چکا ہوں کہ وہ خفیہ فون پر بات کیا کریں اور یہ وہ بات ہے جو وائٹ پیپر میں بھی کہی جا چکی ہے۔ وائٹ پیپر میں بتایا گیا ہے کہ میں نے رفیع رضا کو خبردار کیا کہ وہ عام کھلے فون پر بات نہ کیا کرے کیونکہ یہ محفوظ نہیں ہے۔ مائی لارڈز اگر میں اپنے وزیروں کو یہ کہتا رہا ہوں کہ وہ خفیہ فونوں پر بات کریں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں ایک جرم ایک واردات قتل کے بارے میں اسے کھلے اور عام فون پر بتاتا اور پھر یہ بھی ذہن میں رکھیے کہ خفیہ اور انتہائی محفوظ ٹیلیفون ہمیشہ میری رسائی میں رہے۔ کیا میں انتظار نہیں کر سکتا تھا کہ خفیہ ٹیلی فون پر کچھ دیر کے بعد اس سے بات چیت کروں اور پھر یہ کہ میں اپنے اے ڈی سی کو کہہ سکتا تھا مسعود محمود کو طلب کرو لیکن میں نے یہ دونوں باتیں نہیں کیں۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ ایک کھلا عام ٹیلی فون استعمال کر ہی نہیں سکتا تھا یہ ایک لغو اور احمقانہ کام ہوتا اس لیے میں یہ کہتا ہوں کہ وہ سراسر جھوٹا ہے۔

جب وہ یہ کہتا ہے کہ میں نے اسے صادق قریشی کے گھر بلایا تو تب بھی سراسر جھوٹ

بول رہا ہے۔ یہ شوشا اس کے ڈرائیور منظور حسین نے چھوڑا ہے۔ منظور حسین نے اس ڈرامے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس نے غلام حسین کو لاہور سے راولپنڈی تک لفٹ دی تھی موجودہ مارشل لاء حکومت نے بطور خاص منظور حسین کو دوبارہ ملازمت دی ہے اسے نکالا جاچکا تھا اب اسے واپس لایا گیا ہے۔ اسے ایک اہم گواہ کی حیثیت پیش کیا جارہا ہے مسئلہ یہ ہے کہ اگر منظور حسین غلام حسین کے بارے میں سچ کہتا ہے تو پھر مسعود محمود پر بھی اس سچ کا اطلاق ہوگا منظور حسین کے معاملے میں عدالت نے اسے تحفظ دینے کی کوشش کی اور کہا گیا یہ ممکن نہیں ہے کہ کار کو مسعود محمود چلا رہا ہو۔ یہ ایک عدالتی سوال تھا۔ منظور حسین نے جواب دیا کیونکہ چابیاں اس کے پاس تھیں۔

اور تو اور استغاثہ کے گواہوں میں حنیف رامے بھی شامل ہے جو ایک زمانے میں میری پارٹی کے ایک اہم رکن تھے اور پنجاب کے وزیر اعلیٰ رہے اور ناکام رہے اور پھر جیسا کہ سیاست میں ہوتا ہے انہوں نے مسلم لیگ چھوڑی تو ایک اپنی پارٹی بنالی اس اعتبار سے ان پر میرا کوئی اثر نہیں استغاثہ نے انہیں دو یا تین دن بٹھائے رکھا۔ پہلے دن اسے نہیں بلایا گیا۔ دوسرے یا تیسرے دن انہیں مفتوح قرار دیا گیا۔ اس معزز عدالت نے بجا طور طور پر یہ پوچھا ہے کہ دکھایا جائے کہ اسے کیسے مفتوح کیا گیا۔ آپ محض یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ کیسے متاثر ہو گئے اس کے لیے آپ کو ثبوت دینا ہوگا آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس لیے مفتوح ہو گئے کہ شاید وہ سچ بولنا چاہتے تھے۔ میں نہیں جانتا کیا ہوا۔ پہلے آپ اسے استغاثہ کے گواہوں کی فہرست پر لائیں اور پھر یہ کہا گیا کہ وہ مفتوح ہوچکا ہے۔ مائی لارڈز آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس نے حال ہی میں ٹیلی ویژن پر کچھ کہا۔ اس سے اندازہ لگتا ہے کہ وہ کسی حد تک مفتوح ہو گئے تھے۔ انہوں نے میری پالیسیوں پر شدید اعتراض کیے تھے جب سے انہوں نے حکومت چھوڑی مجھ پر تنقید کرتے رہے۔ جس پر انہوں نے ٹیلی ویژن پر بھی اصرار کیا ہے۔ لہٰذا یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں نے انہیں فتح کر لیا تھا۔

مسعود محمود کے بیان کے مطابق کہ اس نے مجھے فون کیا اور پھر ملا۔ میں کہوں گا کہ یہ چیز اس کے ابتدائی بیانوں میں موجود نہیں ہیں۔ یہ درست نہیں ہیں۔ اس کا اضافہ اس وقت کیا

یا جب کہیں یہ پک گیا اور اس کا تانا بانا بن دیا گیا۔ مائی لارڈ مسعود محمود مزید کہتا ہے کہ وہ اسی روز راولپنڈی پہنچا۔ جس دن میں آیا تھا اور میں نے اسے پھر راولپنڈی میں طلب کیا اگر میں اسے پہلے ہی ملتان میں مل چکا تھا تو پھر اسے ملنے کی کیا ضرورت رہ گئی تھی۔ اور جو آئیڈیا ذہن میں آیا ہے اسے اپنے طور پر عمل میں لائیں۔ اب میرے لیے اس میں فریق بننا بالکل ناممکن ہو گیا ہے۔ اس نے ہر چیز کو ختم کر دیا۔ وہ ایک پاک دیندار آدمی ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ یہ سچ نہیں ہے

مائی لارڈ اگر میں اس میں اتنی ہی دل چسپی لے رہا ہوں کہ خواہ آسمان یا زمین گر پڑیں آسمان گر پڑے گا۔ لیکن احمد رضا کو ہر حال میں ختم ہونا چاہیے تو کیا میرے پاس ایف ایس ایف کے علاوہ کوئی دوسرا ذریعہ یا راستہ نہیں تھا؟ اور مسعود محمود مجھے کہہ رہا ہے کہ وہ اب فریق نہیں بن سکتا۔ اگر ایسا تھا تو پھر وہ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء تک ملازمت میں نہ رہتا۔ آخر ایس ایف ایف کے علاوہ میرے پاس کوئی دوسرا ذریعہ نہیں اور احمد رضا قصوری کا صفایا بھی ضروری ہے۔ اور اگر میں مسعود محمود یا کسی دوسرے شخص ایکس کو اس عہدے پر لاتا ہوں تاکہ وہ یہ خاص مقصد پورا کر سکے۔ تو پھر اس کا کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ یہی آدمی اس عہدے پر جولائی ۱۹۷۷ء تک فوج کے تختہ الٹنے تک فائز رہ سکتا ہے جب کہ اس زمانے میں اس نے بہادری اور مزاحمت کا اعلان کیا اور چرچل جیسا عزم ظاہر کیا وہ نہ صرف یہ کہ وہ اس عہدے پر برقرار رہا بلکہ یہ بھی کہتا ہے کہ میں ۱۱ نومبر ۱۹۷۴ء کے بعد اس کا دشمن بن گیا تھا۔ اگر میں اس کا دشمن ہو گیا تھا تو پھر ایک تصدیق کنندہ سچ بولنے والے گواہ کی حیثیت سے اس کی حیثیت ہی ختم ہو جاتی ہے اگر وہ میرا دشمن ہے تو بھی وہ تصدیق کنندہ کی صفات کو پورا نہیں کرتا۔ یوں اس نے اپنے آپ کو خود ہی غلط اور جھوٹا ثابت کر دیا ہے۔ اب بطور تصدیق کنندہ وہ جھوٹا ثابت ہو چکا ہے۔

یہ آدمی کہتا ہے کہ میں نے اس کے کھانے میں زہر دینے کی کوشش کی۔ میں نے اسے اس کے بچوں کی دھمکی دی۔ میں نے اسے نقصان پہنچانے کی ہر کوشش کی لیکن اس کا تضاد ملاحظہ کیجیے کہ یہ سب کچھ اس نے اپنے پہلے بیانوں میں نہیں کہا۔ پہلے بیان اور

پھر دوسرے بیان میں، اگر کسی شخص کو اس کی بیوی بچوں کی جان لینے کی دھمکی دی جائے تو بھی اس کا ذکر کیوں نہیں کرتا؟ اس کی اس نے ایک دوسری دلیل بھی دی ہے وہ کہتا ہے کہ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے زمانے میں اپوزیشن کے بعض ایسے رہنما تھے جنہوں نے اپنی تقریروں اور بیانوں میں کہا تھا کہ وہ اسے الٹا لٹکائیں گے۔ وہ کہتا ہے ہاں انہوں نے کہا تھا۔ اپوزیشن کے لوگ کہا کرتے تھے کہ وہ اس آدمی کو سبق سکھائیں گے اس سے نمٹیں گے۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ میں تو نہیں کہ جس نے اس کے بیوی بچوں کو دھمکی دی تھی۔ کیا میں بیوی اور بچوں کو دھمکی دے رہا ہوں؟ اس وقت جب کہ وہ ایف ایس ایف میں بطور ڈائرکٹر جنرل بھی کام کر رہا تھا؟ کیا یہ دھمکیاں اسے اپوزیشن دے رہی تھی یا ہم دونوں، تو کیا حکومت اور اپوزیشن دونوں اس حد تک اس کے خلاف ہو گئے تھے۔؟ (جس کا وہ دعوےٰ کرتا ہے) پھر تو کوئی دشواری یا مشکل باقی نہیں رہتی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔

وہ غیر ملکی دوروں پر جاتا رہا۔ وہ جانا چاہتا تھا اور میں اسے اجازت دیتا رہا۔ وہ بہترین ملکوں کے ایک طویل دورے پر گیا۔ بلجیم، فرانس، انگلینڈ، جاپان اور صرف یہی نہیں بلکہ وہ اپنے علاج کے لیے گیا اور اپنے ساتھ اپنی بیوی کو بھی لے گیا میں نے اسے اجازت دی کہ وہ اپنی بیوی کو ساتھ لے جائے۔ اس نے مجھے کہا۔ "میں ایک بیمار آدمی ہوں۔ کیا میں اپنی بیوی کو ساتھ لے جا سکتا ہوں۔ اس کی وہ بیوی جسے میں زہر دینا یا نقصان پہنچانا چاہتا تھا۔ میں نے کہا اگر تم چاہتے ہو تو ساتھ لے جاؤ۔ تم بیمار ہو۔" وہ اپنے ساتھ عبدالحق کو لے جانا چاہتا تھا۔ سو وہ عبدالحق اور اپنی بیوی کو ساتھ لے کر گیا۔

بہت سے دوسرے لوگوں کو یہ بات غیر معمولی دکھائی دے گی۔ لیکن میں نے بہت سے لوگوں کو باہر جانے کی اجازت دی (ان میں مولوی مشتاق حسین لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس بھی شامل ہیں۔ جو ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے اٹلی جانا چاہتے تھے اس معاملے میں میں نے یہ رویہ اختیار کیا تھا کہ میں دوسروں کا مددگار کیوں نہ بنوں؟) ایسی

کئی مثالیں موجود ہیں۔ بہرحال اس نے کہا میں بیمار ہوں، اب اگر آپ بیمار ہیں تو آپ آرام کریں گے۔ اس میں کوئی غیر معمولی یا ابنارمل بات نہیں اور یا پھر بیرون ملک علاج کے لیے جائیں گے لیکن مائی لارڈز، اس میں بھی اس نے کمینگی اور رنجش کا ثبوت دیا اس نے زیارت میں ایک طرف یہ کہا کہ وہ اتنا بیمار کہاں تھا اور دوسری طرف وہ کہتا ہے کہ میں اتنا ظالم تھا کہ میں نے اسے کہا کہ آج ہی لاہور جائے اور دوسرے دن واپس زیارت آئے۔ مائی لارڈ وہ کہتا ہے کہ اسے زیارت میں معمولی سا سٹروک ہوگیا تھا۔ وہ اسے معمولی کہے لیکن وہ درحقیقت مبرا ایک سٹروک ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کی مونچھوں کے ایک طرف کے بال جھڑ گئے۔ وہ کہتا ہے اس سے اس کی پیشانی متاثر ہوئی۔ اور وہ کان سے سننے سے معذور ہو گیا اور اس کا پر لطف اور دلچسپ پہلو ہے کہ میں زیارت میں تھا اور میں اسے بغیر مونچھوں کے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس ماجرا پوچھا تو کہنے لگا کہ اس کی مونچھیں گر گئی ہیں۔ تو تم نے کسی کو اس کی اطلاع کیوں نہ دی وہ کہتا ہے۔ میں نہیں جانتا۔ لیکن سر میں بہت بیمار ہوں۔ براہ کرم مجھے لاہور ایک دن جانے کی اجازت دے دیں۔ لاہور میں ایک سپیشلسٹ ہے جس سے میں مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا (نہیں)، تم ایک دن ہی کے لیے کیوں جا رہے ہو۔ ایسی حالت میں تم زیادہ عرصے کے لیے جاؤ۔ وہ کہتا ہے مسٹر بائی روڈ (امریکی سفیر) کل آپ سے ملنے آ رہے ہیں اور کچھ اور کام بھی ہیں۔ اس لیے میں واپس آ جاؤں گا۔ "جیسا تمہارے لیے مناسب ہو۔" میں نے جواب دیا لیکن جہاں تک میرا مشورہ ہے تم لاہور کے بجائے سیدھے باہر کے ملک چلے جاؤ۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تم ٹھیک ہو جاؤ تو علاج کراؤ یہ سنجیدہ مسئلہ ہے"۔ وہ کہتا ہے، نہیں میں لاہور ایک اچھے ڈاکٹر کے پاس جاؤں گا۔ وہاں میرے رشتے دار ہیں۔ پہلے میں لاہور جاؤں گا۔ وہاں سے صحیح مشورہ لوں گا اور اگر میں پھر بھی ٹھیک نہ ہوا تو بھی واپس آجاؤں گا۔ میں سکون بخش دوائیاں لوں گا اور واپس آجاؤں گا۔" میں نے پھر کہا، "جیسے تم مناسب سمجھتے ہو کرو۔ لیکن میری طرف سے تمہیں اجازت ہے کہ تم جہاں بھی جانا چاہو جا سکتے ہو۔"

یہ اصل صورت تھی۔ لیکن اس مقدمے میں وہ کہتا ہے کہ وہ اتنا بیمار ہی کہاں تھا وہ کہتا ہے۔ "میں بیمار نہیں ہوں۔ اس میں مبالغہ آرائی کی گئی ہے۔"

اس نے مجھے مشورہ دیا تھا سر آپ جانتے ہیں کہ یہاں احتجاجی صورت حال ہے یہ ٹیلی فون کالوں کا انتظام کر رہے ہیں۔ آپ کے بیٹے یہاں ہیں۔ (وہ چھٹیاں منانے آئے ہوئے تھے) اور بیٹیاں (ایک بیٹی وہاں تھی) ایف ایس ایف کو ان کی حفاظت کی اجازت دیجیے۔ ہمیں ایک محافظ یا ایک جیپ کا انتظام کرنے دیجیے۔ میں جواب دیتا "لیکن کیوں؟ ایسا کیوں کیا جائے" وہ کہتا ہے۔ "نہیں سر، ایسا بھی ہونا چاہیے۔ میں نے کہا، اچھا۔ ٹھیک ہے۔ تم اچھی نیت سے کہہ رہے ہو۔ اس لیے میں نے اپنی زندگی، اپنے بچوں کی حفاظت کی ذمے داری اس شخص کو سونپ دی۔ اور میں نے اس کے بچوں اور بیوی کی جان لینے کی دھمکی دی؟ اگر مجھے کہنے کی اجازت دی جائے تو یہ ایک انتہائی مضحکہ خیز تضاد ہے۔

اب میں کچھ پیچھے جا کر اس سوال کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں جو کمانڈر عبرت کے بارے میں ہے۔ (PLD میں یہ کیس رپورٹ کیا گیا ہے۔ یہ سندھ کا کیس ہے) سوال اٹھایا گیا تھا کہ آخر یہی آدمی کیوں، جو ایف ایس ایف کا ڈائرکٹر جنرل ہے۔ واقعی یہ ایک موزوں سوال ہے کہ آخر یہی آدمی کیوں؟ لیکن میں اس سلسلے میں ایک دوسرا سوال کرتا ہوں کہ اگر ایسا ہی تھا تو پھر یہ آدمی ڈھاکہ میں کیوں تھا؟ وہ ڈھاکہ کا ایس ایس پی تھا۔ عبرت کے متعلق ہم اخباروں میں پڑھتے رہے ہیں۔ مائی لارڈ اگر آپ ایسے سوالوں میں جائیں گے تو پھر ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ پھر یہاں قربان علی خاں ہے۔ جو پنجاب کا ڈی جی تھا۔ اس نے سب کچھ کیوں کیا؟ اس نے لائلپور میں یہ کیوں کیا؟

آپ کو لوگوں کا انتخاب اپنی سوسائٹی سے کرنا پڑتا ہے۔ بلکہ سوسائٹی سے نہیں بلکہ اپنے محکموں سے، اگر مسعود محمود کو عبرت کے زمانے میں حکومت سے باہر پھینک دیا جاتا تو پھر وہ ملازمت میں بھی نہ رہتا۔ لیکن اس کے خلاف کوئی کارروائی۔ عبرت کے بعد یا ڈھاکہ فائرنگ کے بعد نہیں کی گئی۔ صرف یہی نہیں بلکہ کاغذات میں مسعود محمود کا ریکارڈ

بھی بہت اچھا ہے۔ جیسا کہ یور لارڈ شپس نے فرمایا ہے۔

اس ریکارڈ کو بھی دیکھنا چاہیئے۔ اس کا سروس ریکارڈ دیکھنا چاہیئے۔ حتیٰ کہ مسعود محمود نے دعوے کیا ہے کہ مسٹر عزیز احمد جو بہت تجربہ کار انسان، سرکاری ملازم اور جو سیکرٹری جنرل اور کیبنٹ سیکرٹری کے عہدوں تک پہنچے۔ انہوں نے بھی اس کے بارے میں بہت اچھی رپورٹ دی۔ میرا خیال ہے کہ اصغر خاں نے اسے بہت اچھی رپورٹیں دیں۔

اس صورت میں اگر ہم ریکارڈ کے ساتھ چلیں اور صفایا کرنے کے طریقۂ کار کو سمجھیں تو پھر یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اصل میں ایسا آئیڈیل شخص کوئی دوسرا تھا ہی نہیں اس کی تقرری کسی سفارش کی وجہ سے نہیں ہوئی تھی۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم نے استحقاق کی بنا پر اس کی تقرری کی۔ اسے کسی خاص مشن یا کام کے لیے وہاں نہیں لایا گیا تھا۔

عدالت میں اس کی راست گوئی پر حملہ کرنے کے لیے اس سے یہ سوال پوچھا گیا کہ کیا وہ کسی شخص منور علی کو جانتا ہے۔ اس نے جواب دیا "ہاں" منور علی خاں طالب علمی کے زمانے میں میرا ساتھی۔ پھر وہ میرے ساتھ ائر فورس میں رہا۔ اور پھر اس سے پوچھا جاتا ہے۔ "تو پھر تم اس منور علی خاں کو جانتے ہو۔" وہ جواب دیتا ہے 'ہاں' میں اسے اس بنا پر جانتا ہوں "کیا تم جانتے ہو کہ وہ کیا کام کرتا ہے۔" وہ جواب دیتا ہے، میں نہیں جانتا کہ وہ کیا کام کرتا ہے۔" کیا منور علی خاں سے تمہاری ملاقات ہوئی۔" "نہیں میں منور علی خاں سے نہیں ملا۔" کسی قسم کا سکینڈل بنانے کی کوشش کے باوجود (کیونکہ ہم سب کے خاندان میں) دوسرا سوال اس کی راست بازی کو چیلنج کرنے کے لیے پوچھا گیا۔ تم نہیں جانتے کہ منور علی خاں کیا کام کرتا ہے۔ تم منور علی خاں سے نہیں ملے۔ فضائیہ کے بعد تم منور علی خاں سے نہیں ملے۔ نہ ہی اس کے ساتھ کوئی رابطہ قائم کیا ہے تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم نے اس کی بیوی سے شادی کی؟" وہ یا تو کوئی راسپوٹین ہوگا یا کوئی بنگالی جو ایسا کام کر سکتا تھا۔ وہ اس شخص کو نہیں جانتا۔ پھر بھی وہ اس کے گھونسلے سے انڈے نکالتا ہے اور کوا اس کے عین اوپر بیٹھ جاتا ہے۔ لیکن عدالت نے یہ

سوال پوچھنے کی اجازت نہیں دی۔ کہا گیا کہ اس سوال سے اس قانون کی رسوائی ہوتی ہے۔ ہرگز نہیں کیونکہ یہ قتل کا مقدمہ ہے۔ مجھے موت کی سزا دینے کے لیے مقدمہ چلایا جا رہا ہے مجھے قتل کے جرم پر مقدمہ چلایا جا رہا ہے تاکہ مجھے پھانسی دے دی جائے اور ہم مرکزی گواہ کی راست بازی کو بھی چیلنج نہیں کر سکتے وہ آدمی جس نے مجھ پر قتل کا الزام لگایا ہے۔ جو بنیادی گواہ اور تصدیق کنندہ ہے۔ ہم اس کی راست گوئی پر حملہ نہیں کر سکتے۔ ہم اس خاتون کو بھی عدالت میں بلوا سکتے تھے، لیکن ہم تو تمہاری سچائی پر حملہ کر رہے تھے۔ ہم تو تمہارے جھوٹ بولنے کی شاندار استعداد کو پیش کر رہے تھے۔

اس سوال کی اجازت نہیں دی گئی۔ کہا گیا کہ یہ سوال اٹھایا نہیں جا سکتا۔ یہ وضاحت کی گئی کہ یہ سوال کن حالات میں اٹھایا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم اس میں کسی خاتون کا نام نہیں آنے دیں گے۔ (آکسفورڈ میں میرے ہم عصر جری تھورپ تھے۔ میں کرائسٹ چرچ میں اور وہ ٹرنٹی میں تھے۔) وہ ایک مقدمے میں کچھ دشواریاں محسوس کر رہے تھے کہ کون سے سوال وہاں پوچھے جا رہے تھے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں دفاع کی طرف سے ہوتا، جبکہ جری تھورپ استغاثہ کی طرف سے تھے، وہ ایسے آدمی ہی نہیں تھے۔ میں انہیں بخوبی جانتا ہوں۔ یہ انتہائی لغو بات ہے کہ ہم انصاف کے حصول کے لیے ایسے سوال نہیں پوچھ سکتے تھے۔ اصل نکتہ بھی یہی ہے۔ مائی لارڈ سب سے پہلے تو ہمیں یہ موقع ہی نہیں دیا گیا کہ ہم پوری طرح مسعود محمود پر جرح کر سکتے کہ آخر اس نے اپنے متنازعہ اور اختلافی بیانات کیوں اور کیسے دیئے جو ملتان اور راولپنڈی کے بارے میں تھے۔ جن پر اس نے ایک طویل لیکچر دیا تھا۔ ان بیانوں میں اس نے مجھ پر اس حد تک الزامات لگائے تھے کہ میں نے اسے کہا تھا کہ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو میں اپنے بیٹے میر غلام مرتضیٰ بھٹو، اپنے بیٹے، اپنے وارث، جس کی ہمت پر میں بے حد نازاں ہوں۔ جو آکسفورڈ میں ہے۔ اسے بھی قتل کر دوں گا۔ میں نے خود اپنے بہادر بیٹے کی تربیت کی ہے اور میں نے اس آدمی سے کہا کہ میں اسے قتل کر دوں گا؟ مائی لارڈ مجھے ایک سفاک قاتل ثابت کرنے کے لیے بھی ایک حد کی ضرورت ہے۔ مجھے ایک ایسا قاتل ثابت کیا جا رہا جو اپنے ہاتھوں سے اپنے ہی بیٹے کو جس کی پرورش میں نے اپنے ہاتھوں سے کی ہے، قتل

کرسکتا ہوں۔ لیکن اس بیان کو مسترد نہیں کیا گیا۔ اسے ایک لفافے میں رکھا گیا ہے اور وہ میرا بیٹا میرے لیے جان دے سکتا ہے۔

یہ ایک ضروری ریمارک ہے۔ یہ ایک جعلی اور جھوٹا ریمارک ہے۔

میں نے اس کے ساتھ اس انداز میں مصطفےٰ کھر کے بارے میں بھی کبھی بات نہیں کی۔ مجھے اس میں منسلک کرنے کے لیے اس نے مصطفےٰ کھر کے بارے میں بھی جھوٹ بولا ہے۔

آنریبل چیف جسٹس :۔ ایسا ہو سکتا ہے۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو :۔ کیونکہ میں نے ہمیشہ مصطفےٰ کھر کو اپنے خاندان کا ایک فرد سمجھا ہے۔

آنریبل چیف جسٹس :۔ بظاہر آپ اس کے غلط رویّے سے مایوس اور ناخوش ہوتے تھے۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو :۔ اس کا بھی ایک سیاسی پس منظر ہے۔ اس کے متعلق ایک بڑی کہانی ہے۔ اسے چھوڑ ہی دیں۔ یہ ریکارڈ کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی میں اس سے ناراض نہیں ہوا تھا۔ وہ مجھے ملتا رہتا تھا۔ اس زمانے میں وہ آتا رہتا تھا اور وزیر اعظم ہاؤس میں قیام بھی کرتا تھا۔ وہ میرے ساتھ شکار کے لیے بھی جاتا تھا۔ کیونکہ اس میں ایک دوسری حقیقت ملوث تھی۔ یہ قطعی طور پر ایک سیاسی مسئلہ تھا۔ میں نے مصطفےٰ کھر کے بارے میں ایسی باتیں کہی ہیں جو میں اپنے بیٹے کے لیے بھی کسی حوالے سے نہ کہہ سکتا تھا۔ چڑنگ کا ثبوت تو اسے کھانے سے ہی ملتا ہے۔ آج مصطفےٰ کھر کا رویّہ کیا ہے ہم انسان تھے ہمارے مزاج پاکستانی تھے۔ آج مصطفےٰ کھر کا رویّہ کیا ہے؟ اسے کیا ترغیب دی گئی؟ یہ ریکارڈ پر نہیں ہے۔ اس نے ایک بیان حلفی داخل کیا جس میں اس نے بتایا ہے کہ اسے کیسی کیسی ترغیبات دی گئیں۔ اس حکومت کا ایک رکن لندن جاتا ہے اور دو بار مصطفےٰ کھر سے ملاقات کرتا ہے اور مصطفےٰ کھر کو ان ترغیبات، اور پیش کشوں کو ٹھکرا دیتا ہے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں نے مصطفےٰ کھر کے بارے میں ایسی باتیں مسعود محمود

سے کی ہوں گی اور اگر ایسی باتوں کو اُٹھایا گیا ہے تو پھر میرے بیٹے کے بارے میں ایسی باتیں نہیں کی جا سکتی ہیں۔ خواہ یہ میرا مثال دینے کا ہی انداز کیوں نہ ہو۔ مائی لارڈ اس لیے یہ پوائنٹ کہ یہ شخص اس حد تک چلا گیا۔ کون ہے۔ یہ مسعود محمود آخر ہے کیا۔ کہ جسے بطور وزیر اعظم اپنے ایک ماتحت کو ایسی ڈرامائی مثالیں دوں . . .

آنریبل چیف جسٹس :۔ ہم یہ نکتہ نوٹ کر چکے ہیں کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو :۔ وہ ایک بڑے جرم کے حوالے سے جھوٹ بول رہا ہے۔

آنریبل چیف جسٹس :۔ آل رائٹ ، ہم نے اسے نوٹ کر لیا۔

ذوالفقار علی بھٹو :۔ مائی لارڈ میں اس شخص کی راست گوئی ، کردار اور جھوٹ بولنے کی استعداد پر دلائل دے چکا ہوں۔ دوسرے یہ کہ اس نے خود ہی بطور ایک تصدیق کنندہ کے اپنی نفی کر دی ہے۔ جس کی وجہ اس کی میرے ساتھ دشمنی ہے۔ وہ دشمنی جس کا اس نے خود اعلان اور دعوے کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے تمام صورت حال کو مکمل اور بھرپور صورت میں بیان نہیں کیا نہ ہی مواد کے حوالے سے اور نہ ہی بنیادی سوالوں کے جواب ہی دیے ہیں۔ اس کے جھوٹے دعوؤں کے بارے میں میں منور علی کے بارے میں اس کے ریمارکس اور مصطفیٰ کھر اور میر غلام مرتضیٰ خان کے بارے میں اس کے جھوٹ بیان کر کر چکا ہوں۔ اب تیسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ سیٹھ عابد کو نہیں جانتا۔

سیٹھ عابد کی اس سے رشتے داری ہے۔ سیٹھ عابد کو سمگلر کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ اور وہ حکومت کو مطلوب تھا۔ یہ سب کچھ ریکارڈ پر ہے۔ وہ قصور سے آیا ہے۔ سیٹھ عابد ہی اسے کیمپ جیل لاہور میں کھانا پہنچاتا ہے لیکن مسعود محمود کہتا ہے کہ اسے یہ معلوم نہیں کہ سیٹھ عابد واپس آگیا ہے۔ ”میں نہیں جانتا کہ اسے یہ اجازت دے دی گئی کہ وہ پاکستان میں ایک بینک جاری کر سکے۔“ وہ اس آدمی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا جو اس کا قریبی رشتے دار ہے۔ جس کی اس کی بہن سے شادی بھی ہوئی ہے۔ آخر کار ، اسے اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ تو معلوم ہونا ہی چاہیے۔“ وہ بہت مشہور مقدمہ تھا۔ ایک جانا پہچانا مقدمہ ، ہم دو برس تک اس سمگلر کو پکڑنے کے لیے کوشش کرتے رہے اور وہ پاکستان سے غائب

ہوگیا۔ جب مارشل لا کا نفاذ ہوتا ہے تو وہ پاکستان لوٹتا ہے اور اسے معاف کر دیا جاتا ہے۔ اس کے خلاف جتنے مقدمے تھے ان سب کی صفائی کر دی گئی اور ایسے کیس ہی توڑ دیے جاتے ہیں جن کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اسے پاک صاف کر دیا گیا ہے۔ سیٹھ عابد پاکیزہ ہوگیا اور اس آدمی کو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ شخص پاک ہوگیا ہے؟ اس کے خلاف مقدمے واپس لے لیے گئے ہیں۔ اسے بے خطا ثابت کر دیا گیا ہے۔ اس کا سب کچھ بحال ہوگیا ہے۔ اسے دوبارہ معزز شہری بنا دیا گیا ہے۔ اسے بینک کھولنے کی اجازت مل گئی ہے۔ اس کے انکم ٹیکس کے مقدمے لے لیے گئے ہیں۔ لیکن مسعود محمود نہیں جانتا

مسعود محمود کی بیوی مسز این اے فاروقی کی ایک کزن ہے۔ خان بہادر قیوم کی بیٹی۔ مسعود محمود کہتا ہے وہ این اے فاروقی کو نہیں جانتا جو لاہوری فرقے کے احمدی ہیں۔ بیگم این اے فاروقی کو میں اپنے بمبئی کے زمانے سے جانتا ہوں اور وہ بہت اچھے لوگ ہیں۔ وہ نہیں جانتا کہ یہی این اے فاروقی مغربی پاکستان کے چیف سیکرٹری تھے۔ کیبنٹ سیکرٹری جو حکومت کے انتہائی اہم سرکاری عہدے پر فائز تھے۔ اس لیے نہیں کہ وہ لاہوری فرقے کے احمدی تھے۔ بلکہ اس لیے وہ بہت اہم شخصیت تھے۔ بیگم این اے فاروقی اور مسعود محمود کی بیوی۔ بہنیں ہیں یا کزن لیکن وہ کہتا ہے۔ "میں نہیں جانتا"

اور آخر تم جانتے کیا ہو؟ تم صرف یہی جانتے ہو کہ میں اپنے بیٹے غلام مرتضےٰ کو ہلاک کر سکتا ہوں۔ بس یہی کچھ ہے جو تم جانتے ہو۔ تم سیٹھ عابد کو نہیں جانتے۔ تم سازش کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ جو منصوبہ تھا تم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ تم اس میں شریک نہیں ہو۔ تم غلام حسین کو نہیں جانتے۔ تم کسی کو بھی نہیں جانتے۔ تم کچھ بھی نہیں جانتے۔ تم اتنے معصوم ہو کہ تم مرکزی تصدیق کنندہ بن گئے۔ تصدیق کنندہ کے پاس معلومات بھی ہونی چاہئیں اس کا حصہ لینا ضروری ہوتا ہے۔ اس کا فریق ہونا لازمی ہوتا ہے۔ وہ ڈرامے کا ایک حصہ اور جزو ہونا چاہیے۔

مائی لارڈ، جب اس سے اس کی حراست کے بارے میں سوال پوچھے گئے اور یہ سوال اس لیے پوچھا جانا فطری ہے کہ موجودہ حکومت نے کیا کچھ حاصل کیا۔ کیا کامیابیاں پائیں

یہ پہلا موقع ہے کہ جونہی مارشل لا کا نفاذ کیا گیا۔ سرکاری ملازموں کو فی الفور حراست میں لے لیا گیا۔ اگلی دفعہ شاید ججوں کو بھی حراست میں لے لیا جائے۔ کون کچھ جانتا ہے لیکن اس بار پہلی دفعہ ایسا ہوا کہ مارشل لا کے نفاذ کے ساتھ ہی سرکاری حکام کو حراست میں لے لیا گیا۔ سرکاری حکام میں وہ پہلا افسر تھا جسے حراست میں لیا گیا۔ وہ ایبٹ آباد لے جایا جاتا ہے۔ ایک میجر جنرل کی ٹیم تحقیقات اور اس سے پوچھ گچھ کرتی ہے۔ میجر جنرل کالوں اس سے پوچھ گچھ کرتا ہے۔ دو مختلف ٹیمیں اس پر تحقیقات کرتی ہیں۔ توہین کے مقدمے میں اس نے خود مسٹر جسٹس ذکی الدین پال کی عدالت میں خود اس کا اعتراف کیا ہے۔ اس نے اس مسئلے کو متصوفانہ، رنگ دینے کے لیے کیا" اعلیٰ احکام" اس سے پوچھا گیا "کیا اتھارٹی سے اس کی مراد مارشل لاء اتھارٹیز ہے" "بس ریکارڈ پر اتنا کچھ ہی ہے۔

اگر میں ایک "عادی جھوٹا" ہوں تو یہ ایک مادر زاد پیدائشی جھوٹا ہے۔ اس نے کیسے کیسے جھوٹ بولے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ وہ ٹیم کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ وہ اس سے باخبر ہی نہیں اس نے اپنا سینہ صاف کرنے کے لیے ایک سو صفحے پر مشتمل ایک خط لکھ کر دیا۔ انصاف کے عام طریقہ کار کے بجائے یہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے نام کیوں لکھا گیا؟ اور یہی وہ خط ہے جس کے بارے میں فرض کر لیا گیا کہ یہ میرے خلاف ہے آپ سعید خاں کو بیچ میں گھسیٹ لائے جبکہ میں سعید احمد خاں کو بیچ میں نہیں لایا تھا؟ آپ سعید احمد خاں کو تحقیقات میں کیسے لے آئے؟ ایسی تفتیش تو ایس ایچ او پولیس کے ذریعے یا زیادہ سے پنجاب پولیس کے ذریعے کی جاتی ہیں۔ اور پھر مسعود محمود کا وہ خط، جسے سٹینو گرافر کی مدد سے لکھا گیا، جو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ براہ راست کس طرح چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے نام لکھا گیا؟ اور پھر ایسے وقت میں جبکہ چیف مارشل ایڈمنسٹریٹر قومی اور دوسرے ملکی مسائل میں گلے سے اوپر تک پھنسا ہوا ہے۔ انتظامیہ پر قبضہ کر لینے کیساتھ ساتھ، ایسے کتنے ہی دیگر مسائل ہوں گے۔ جن کا چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر پر شدید دباؤ ہوگا۔ آخر چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کو اس مقدمے میں کیوں داخل کیا گیا۔ جبکہ سعید احمد خان کا معاملہ لاہور جا چکا تھا اور اس فرضی ٹیلی فون کالوں کو اس کیس میں صحیح مان لیا گیا تھا

اگر یہی پوزیشن ہے تو اور بہت کچھ بھی بہت مستند ہے اور اس سے یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ اس نے وہ خط کسی ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کو کیوں نہ لکھا۔ یا کسی سب مارشل لا ایڈمنسٹریٹر یا اس سے بھی کسی نچلے عہدے کے افسر یا ایف آئی اے کو کیوں نہیں لکھا۔؟"

طریقۂ کار ایک ہی۔ راؤ رشید کے بھی میجر جنرل ہی گئے۔ ایک ایم عبدالرحمان۔ جس نے راؤ رشید سے کہا کہ اگر تم مسٹر بھٹو کو اس قتل کے مقدمے میں ملوث کرتے ہو۔ انتخاب کے مقدمے میں، ہم تمہیں ملازمت میں رکھیں گے۔ سعید احمد خاں نے بھی ایک تیس صفحات کا خط چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے نام لکھا تھا۔ ان سب سے یہی پوچھا گیا۔ ان کو یہی بتایا گیا کہ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر آپ سے اس سوالنامے کے جواب چاہتے ہیں لیکن کیوں؟ لیکن جیسے کہ میں کہہ چکا ہوں۔ میں غیر ضروری طور پہ دوسرے لوگوں کے معاملے میں اُٹھنے والے سوالوں کی طرف نہیں جاؤں گا۔ میں یقین دلا چکا ہوں کہ میں اپنے وعدے کا پکا ہوں۔ میں افراد کو بدنام اور رسوا کرنا نہیں چاہتا۔

اب سوال ہے اس بوجھ اور دباؤ کا جو مسعود محمود پر ڈالے گئے۔ وہ ایک مریض ہے اسے دل کا عارضہ لاحق ہے۔ وہ شدید تناؤ والا مریض ہے۔ وہ واپس آتا ہے تو خاص قسم کے آلات ساتھ لاتا ہے۔ عینکیں اور اونچا سننے والا آلہ، ان تمام حقائق کے باوجود میں اس سے ہمدردی کا سلوک کرتا ہوں۔ کیونکہ میں اپنے دفاع کے لیے کسی دوسرے پر حملہ کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن ان وجوہات سے قطع نظر یعنی سٹینوگرافر، اس کا عبدالحق، اس نے اہم ٹھوس سوالوں کا جواب نہیں دیا۔

مختصراً میں دو اور دو کو جمع کر رہا ہوں۔ مسعود محمود ایک تصدیق کنندہ نہیں ہے۔ آپ اسے کسی طرح بھی تصدیق کنندہ کی ذیل میں نہیں رکھ سکتے۔ کیونکہ خود اس نے کہا ہے کہ ۱۱ر نومبر ۱۹۷۴ء سے میں اس کا جانی دشمن بن گیا تھا۔ جو اس کے خاندان کو قتل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی بیوی اور بچوں کو، دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ اسے اس لیے تصدیق کنندہ قرار نہیں دیا جا سکتا کہ وہ کہتا ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں جانتا۔ اس پلاٹ اور اس سے متعلق لوگوں کے بارے اسے کچھ علم نہیں۔ یہ میں اس کے منہ پہ یہ ثابت کرنے

کی کوشش کر رہا ہوں کہ وہ جھوٹا ہے۔ اس لیے میں نے منور خاں، این اے فاروقی، سیٹھ عابد اور میر غلام مرتضیٰ خاں کا حوالہ دیا۔ اس حوالے سے اس رابطے سے میں نے کہا ہے کہ اس نے ایک سو صفحات پر مشتمل ایک خط لکھا۔

بے شک، مارشل لا کے دنوں میں ایسا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ مارشل لا، مارشل لا ہوتا ہے۔ آپ نے مارشل کے بارے میں جو فیصلہ دیا ہے۔ وہ میرے خیال میں ایک مثبت فیصلہ ہے لیکن دوسرے دن آپ نے یہ کہا مائی لارڈ کہ ہم نے مارشل لا کی توثیق کر دی ہے۔ لیکن آپ نے ایک سادہ چیک کی توثیق نہیں کی ہے۔ آپ نے نہیں دیا۔۔۔۔

آنریبل جج:۔ نہیں نہیں نہیں۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو:۔ پلیز ایک سادہ چیک نہ دیجیے۔

آنریبل چیف جسٹس:۔ ہم اس فیصلے کی حمایت کرتے ہیں۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو:۔ آپ کی توثیق منطقی بنیادوں پر ہے۔ ان شرائط پر جس سے آپ نے اس کی تعریف کی ہے اور ضرورت کے سکوپ کو محدود کر دیا ہے اور جوڈیشل نظر ثانی کی کے اختیار کو یہاں لے آئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر آپ کے فیصلے پر صحیح انداز سے سے عمل کیا گیا تو یہ اس ملک کو بچانے میں فیصلہ کن ثابت ہوگا۔ اس فیصلے میں آپ نے آئین ایک پھول، ایک گلدستہ دیا ہے۔ اگر وہ اسے روندتے ہیں۔ اس پھول اس گلدستے کو تو یہ ایک بہت بڑا ملکی المیہ ہوگا۔ اگر انہوں نے اس کے ساتھ پھول جیسا برتاؤ کیا جو کیا جانا چاہیے تو وہ اس ملک کو بچانے کے لیے بہت بڑی خدمت انجام دیں گے کیونکہ یہ ملک اس وقت نازک ترین حالات سے گزر رہا ہے۔ لیکن وہ اس گلدستے کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ کیا وہ اسے پھینک دیں گے۔ اسے روندیں گے جیسا کہ بدقسمتی سے وہ ایسا کرتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔

چوتھا دِن

مسٹر بھٹو کو اپنی معروضات جاری رکھنے کی دعوت دینے سے پہلے آنریبل چیف جسٹس نے فرمایا کہ خواتین و حضرات جو یہاں موجود ہیں۔ ان میں سے کسی نے پاکستان ٹائمز میں شائع ہونے والی ایک خبر دیکھی ہوگی کہ متوفی نواب محمد احمد خاں کی بیوی نے ہز لارڈشپ کے نام ایک ٹیلیگرام بھیجا ہے۔ جس میں درخواست کی گئی ہے کہ ان کے بیٹے احمد رضا قصوری کو بھی سماعت کا موقع فراہم کیا جائے۔ کیونکہ مسٹر بھٹو نے ان کے خلاف بعض انتہائی گھٹیا الزامات لگائے ہیں۔ جن کا جواب دینا انتہائی ضروری ہوگیا ہے اور یہ کہ وہ اپنی بیماری کی وجہ سے سروسز ہسپتال میں علاج کے لیے نہیں گئیں۔ یہیں رہ سکتی ہیں اور وہ اس سلسلے میں خود سپریم کورٹ میں وضاحت پیش کرنے کے لیے آئیں گی۔ ہز لارڈشپ نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہم متوفی کی بیوہ کے جذبات کی قدر کرتے ہیں۔ لیکن جہاں تک عدالت کا تعلق ہے ان کا بیٹا یہاں بطور گواہ پیش ہو چکا ہے۔ اور یہی کچھ تھا جو ہونا چاہیئے تھا۔ اس کے بعد اس مرحلے میں مقدمے میں فریق کی حیثیت سے کسی طرح کی معروضات پیش کرنے کی اب کوئی گنجائش نہیں رہی۔

ہز لارڈشپ نے مزید کہا کہ بطور گواہ مسٹر قصوری کو پورا اور مکمل موقع فراہم کیا گیا تھا۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ وہ پوری تفصیل سے کہیں اور یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کسی گواہ کو عدالت سے خطاب کرنے کی اجازت دی جائے۔ یہ ملزم کا حق ہوتا ہے یا استغاثے کے وکیل کا، اور مسٹر قصوری کو وکیل ہونے کی وجہ سے اپنی والدہ کو یہ مشورہ دینا چاہیئے تھا کہ وہ ایسی کوئی

ٹیلیگرام نہ بھیجیں۔ کیونکہ اس سے کوئی مفید مقصد پورا نہیں ہوتا۔ عدالت میں مسٹر قصوری کی موجودگی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے اس یقین کا اظہار کیا کہ اس عدالت کے ایک ایڈووکیٹ ہوتے ہوئے عدالت کے آداب اور طریقہ کار سے واقف تھے کہ دونوں اطراف کے لیے کتنا ہی تکلیف دہ کیوں نہ ہو یعنی ایک وہ جس پر مقدمہ چلایا جا رہا ہے اور دوسری طرف کہ جس کا باپ یا شوہر اغلباً قتل کر دیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ غمزدہ خاندان ہمدردی کا استحقاق رکھتا ہے لیکن اسے یہ حق حاصل نہیں کہ وہ عدالت سے خطاب ......

اس نکتے پر مسٹر احمد رضا قصوری نے مداخلت کرنے کی کوشش کی لیکن انہیں خاموش بیٹھے رہنے کے لیے کہا گیا۔

اس مرحلے پر مشترکہ ملزموں کے وکیل مسٹر ارشاد قریشی اُٹھے اور اپنے موکلوں کی کی طرف سے مسٹر بھٹو کے بیان کے خاتمے کے بعد عدالت کو خطاب کرنے کی اجازت کے لیے درخواست کی۔ اور اس حوالے وہ مقدمے عمومی دفاع کریں گے۔ یعنی فیڈرل سکیورٹی فورس اور اپنے بارے میں .....

اس موقع پر ایک آنریبل جج نے اپنی رائے دی کہ اب مزید کسی قسم کی سماعت نہ ہوگی اور مسٹر قریشی کے مؤکل اس جگہ نہیں کھڑے ہیں جہاں کہ شکایت کنندہ کھڑا ہے۔ اس کیس میں اس مرحلے پر جبکہ وہ اپنے جرم کو تسلیم کر چکے ہیں۔ اعتراف کر چکے ہیں کہ وہ ایک جرم کر رہے تھے۔ اس لیے ان کی سماعت کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ آنریبل چیف جسٹس نے مسٹر بھٹو کے بیان جاری رکھنے کی اجازت دیتے ہوئے مسٹر بھٹو سے کہا کہ وہ اپنا بیان شروع کریں ....

اس مرحلے پر مسٹر بھٹو نے عدالت عالیہ کو تحریک التوا اور تحریک استحقاق کے فرق کے حوالے سے قصوری کی تحاریک کے بارے میں مزید وضاحت کی جو اس نے مختلف اوقات میں قومی اسمبلی میں پیش کی تھیں اور یہ بھی بتایا کہ ان تحاریک کو قومی اسمبلی نے اس وجہ سے بھی قابل اعتنا نہ سمجھا ان امور میں قصوری نے جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ تحریک التوا یا تحریک استحقاق کی جملہ پر پورا نہیں اترتا تھا۔ نیز قومی اسمبلی اس سلسلے میں کوئی مداخلت

اس لیے نہیں کر سکتی تھی کہ یہ تمام معاملات عدالت یا تفتیش کے زمرے میں آ چکے تھے۔ اس لیے انصاف اور قانون کے تقاضوں کو کما حقہٗ پورے کرنے کے لیے قومی اسمبلی عدالتی اور تفتیشی اور اس قسم کی مداخلت کا استحقاق نہ رکھتی تھی۔ اس لیے قصوری کی تمام تحاریک بے معنی اور بے کار ہو گئیں۔

اس کے علاوہ مسٹر بھٹو نے استغاثے کے مؤقف اور سازش کے نکتے کی اور اس کے خلاف مزید دلائل دیتے ہوئے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ استغاثے کے مرکزی گواہوں کے بیانات کے اختلافات سے ہی ثابت ہو جاتا ہے کہ ایسی کسی سازش کا کوئی وجود نہ تھا جو قصوری کو قتل کرانے کے لیے کی گئی تھی۔ اور وہ کسی بھی طرح کی سازش یا منصوبے میں کسی طرح بھی ملوث نہیں تھے۔

اور اب، مائی لارڈز اس مقدمے کی سماعت کے سوال پر آتا ہوں۔ جب مجھے ۲۴ تاریخ کو دوبارہ ایک نامکمل چالان کے ساتھ لایا گیا۔ یہ اس حقیقت کو پہلے ہی یور لارڈشپس کے سامنے بیان کیا جا چکا ہے۔ اس سلسلے میں درخواستیں اور عرضیاں پیش کی گئیں۔ ابھی عدالت کے سماعت کرنے کے حق اور مجاز ہونے کا فیصلہ بھی نہ ہو پایا تھا کہ اگلی سماعت کا سوال پیدا ہو گیا۔ کریمنل پروسیجر کوڈ کے مطابق مجھے یقین ہے کہ کم از کم سات دن وہ مہلت ہے جو فراہم کی جاتی ہے۔ اس وقت میرے سینئر ایڈووکیٹ سپریم کورٹ میں یور لارڈشپس کے سامنے ایک اہم رٹ درخواست کے ضمن میں پیش ہو رہے تھے اور ایک ایڈووکیٹ جنہیں میں نے مقرر نہیں کیا تھا بلکہ جو میری پارٹی کے ایک رکن تھے۔ اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہا وہ بات کہی جو میرے وکیلوں نے درخواست میں ضرور کہی ہوگی۔ اس ایڈووکیٹ نے کہا۔ اور حتیٰ کہ مسٹر بھٹو بھی یہ درخواست کر چکے ہیں کہ تین ہفتوں کی مہلت دی جائے تو یہ مہلت دے دینی چاہیے ان الفاظ پر غیر ضروری حساس پن کا مظاہرہ کیا گیا۔ یعنی یہ الفاظ "کہ حتیٰ کہ مسٹر بھٹو" اس پر قائم مقام چیف جسٹس یک دم جذباتی ہو گئے۔ "اور حتیٰ کہ مسٹر بھٹو کے بعد کیا؟" اور اس اس سے تمہارا کیا مطلب ہے کہ حتیٰ کہ مسٹر بھٹو کے بعد ...... " ان الفاظ "حتیٰ کہ مسٹر بھٹو" کا

استعمال ان کے لیے اشتعال اور طیش کا سبب بن گیا۔ مَیں اس بدمزگی کو کم کرنا چاہتا تھا۔ اس بات کو ختم کرنے کے لیے مَیں نے آفتاب گل سے کہا کہ وہ بیٹھ جائیں اور کہا جہاں تک وقت اور مہلت کا تعلق ہے۔ عدالت یہ کہہ چکی ہے کہ اگر مجھے زیادہ وقت کی ضرورت ہے تو عدالت مجھے زیادہ مہلت عنایت کر دے گی اور مقدمے کی سماعت کے آغاز کے بارے میں مجھے عدالت پر اعتماد ہے۔

۲۵ تاریخ کو یعنی اس سے اگلے دن پریس میں اس بارے میں کوئی خبر شائع نہیں ہوئی لیکن میرے وکیل نے سپریم کورٹ میں جو کچھ کہا تھا۔ اس کی خبر ۲۵ تاریخ کے پاکستان ٹائمز میں شائع ہوئی۔ یعنی یہ کہ مَیں نے یور لارڈشپس کے سامنے ایک درخواست پیش کی ہے کہ مجھے خوف ہے کہ مجھ پر دیانت داری سے مقدمہ نہیں چلایا جائے گا۔ اور مجھے قائم مقام چیف جسٹس کی غیر جانبداری پر اعتماد نہیں۔ اس سے اگلے دن ۲۶ تاریخ کو پاکستان ٹائمز میں ایک خبر شائع ہوئی جس میں بتایا گیا کہ مَیں نے مقدمے کی سماعت کرنے والی عدالت پر اپنے مکمل اعتماد کا اظہار کر دیا ہے۔

مائی لارڈز، مَیں نے اپنے مکمل اعتماد کا اظہار ایک بار نہیں بلکہ دو مواقع پر کیا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ مَیں نے وہاں اپنے مکمل اعتماد کا اظہار نہ کیا تھا۔ جو کچھ کہا گیا ہے وہ بدمزگی کے حوالے سے کیا گیا تھا۔ جو "حتیٰ کہ مسٹر بھٹو ـــ" کے الفاظ سے پیدا ہوئی تھی۔ اس لیے مَیں اُٹھا اور مَیں نے عدالت کی توجہ ۲۶ تاریخ کے پاکستان ٹائمز میں شائع ہونے والی خبر کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کی۔ کیونکہ یہ بات بہت عجیب اور حیران کن معلوم ہوتی ہے کہ ایک طرف تو مَیں نے اپنے وکیل کو یہ ہدایت دی کہ مقدمے سننے والی عدالت پر میرے اعتماد کے فقدان کا اظہار عدالت عالیہ کے سامنے پیش کرے اور دوسری طرف یہ اظہار کر رہا ہوں کہ مجھے مقدمہ سننے والی عدالت پر مکمل اعتماد ہے اور اپنے وکیل اور خود اپنے آپ کو جھٹلا رہا ہوں

مَیں نے عدالت کو اسی لیے یاد دلایا کہ یہ بات مَیں نے مسٹر آفتاب کی مداخلت کی وجہ سے کہی تھی۔ اور جو کہا، جس اعتماد کا اظہار کیا۔ وہ اسی تعلق سے تھی اس پر مسٹر جسٹس مشتاق حسین نے کہا۔ ہم اس کے ذمے دار نہیں ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ نے گزشتہ روز یہی بات

کہی تھی۔ آپ نے اس مداخلت کے حوالے سے کہا تھا۔

لیکن اس کے باوجود تین ہفتوں کی وہ مہلت جس کی ہمیں ضرورت تھی، اس کی اجازت نہیں دی گئی۔ مجھے ۵ جولائی سے ہی حراست میں لے لیا گیا تھا اور ظاہر یہ کیا گیا کہ حفاظتی مقاصد کے لیے نظر بند کیا گیا ہے۔ لیکن یہ قید تنہائی تھی۔ اس کے بعد مجھے رہا کر دیا گیا اور پھر دوبارہ لرزہ دینے والے حالات میں گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے بعد مجھے صرف تین دنوں کے لیے رہا گیا اور پھر جیل میں لے جایا گیا۔ ان حالات کے پیش نظر اگر مقدمے کی سماعت کے التوا کو منظور کر لیا جاتا تو یہ انتہائی جائز اور درست بات ہوتی۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا اور مقدمے کی سماعت کے آغاز کے لیے ۲ اکتوبر کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔

لیکن ۲ اکتوبر کو مقدمے کی سماعت کا آغاز ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ عدالت مقدمے کی سماعت کرنا نہیں چاہتی تھی۔ بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ بہت سی ایسی دستاویزات جن کی مقدمے کی سماعت کے آغاز کے لیے ضرورت تھی۔ انہیں استغاثہ فراہم نہ کر سکا۔ یوں مقدمے کی سماعت ۱۱ اکتوبر تک کے لیے ملتوی کر دی گئی۔ یہ التوا مہلت دینے کے لیے ہماری درخواست پر نہیں کیا گیا۔ بلکہ اس لیے کہ دستاویزات فراہم نہ کی گئی تھیں۔

۱۱ اکتوبر سے پہلے غلام علی میمن دو درخواستیں برائے تحریک ہائی کورٹ میں داخل کر چکے تھے۔ ان میں سے ایک درخواست کا تعلق دستوری امور سے تھا۔ جس پر ہم بطور خاص توجہ دے رہے تھے۔ اس ضمن میں میں نے یہ درخواست پیش کی تھی کہ اس تعلق سے مجھے دلائل پیش کرنے کی اجازت دی جائے۔ عدالت کے کھلے اجلاس میں مجھے یہ یقین دلایا گیا کہ اس ضمن میں مجھے اجازت دی جائے گی اور میں گھنٹوں بول سکوں گا۔

ایک دوسرے موقع پر مجھے پھر یہ یقین دلایا گیا۔ جب مجھے بتایا گیا۔ "آپ کو گھنٹوں بولنے کی اجازت دی جائے گی۔ اور ہم آپ کو پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ اس کا آپ کو پورا پورا موقع فراہم کیا جائے گا۔" یہ بات عدالت کے بند اور خفیہ اجلاس میں نہیں کہی گئی تھی۔ بلکہ عام اور کھلے اجلاس میں یہ یقین دہانی کرائی گئی۔ جبکہ تمام ایڈووکیٹ اور دوسرے افراد بھی موجود تھے۔

۸ اکتوبر کو جب غلام علی میمن نے اپنے دلائل ختم کیے تو میں بولنے کے لیے اٹھا۔

مجھے حقارت اور غرور سے کہا گیا کہ مَیں بیٹھ جاؤں۔ اس وقت مجھے کہا گیا تھا کہ اگر مجھے سٹینوگرافر کی ضرورت ہو گی تو مجھے ایک سٹینوگرافر فراہم کیا جائے گا اور یہ کہ میں جو کچھ بھی کہنا چاہتا ہوں اس کا اظہار درخواست میں کر سکوں گا۔ اور اس سلسلے میں عدالت ایک حکم مجھے جاری کر چکی ہے۔

مائی لارڈ، یہ آئینی معاملات تھے۔ یہ بہت فوری نوعیت کے اہم امور تھے۔ ان پر سرسری گفتگو ہو رہی تھی۔ اور دوسرے فریق کو نوٹس تک نہیں دیا گیا تھا۔ اور اس سے قطع نظر، ۸ تاریخ کو میں ان امور کے متعلق جو کہنا چاہتا ہوں سٹینوگرافر کو ڈکٹیٹ کرا سکتا ہوں، اس کے بعد مَیں نے بڑے ادب سے عدالت کو بتایا کہ دو بار مجھے دو مختلف مواقع پر جو یقین دہانی کرائی گئی کہ مَیں اس عدالت سے ان آئینی امور پر خطاب کر سکوں گا اور اب اچانک مجھے یہ بتایا جا رہا ہے کہ میں عدالت کو درخواست دوں۔ جس پر ۹ اکتوبر کو حکم جاری کر دیا گیا۔ اس مرحلے میں بھلا مَیں سٹینوگرافر کو کیا لکھوا سکتا تھا؟۔ کس طرح سے اپنی معروضات پیش کر سکتا تھا۔

مائی لارڈز، اس ضمن میں دو احکام بھی جاری کیے گئے۔ جن میں بذات خود تضاد تضاد پایا جاتا ہے۔ ایک حکم میں یہ کہا گیا ہے کہ ایسی کوئی یقین دہانی نہ کرائی گئی تھی کہ آپ کو عدالت سے خطاب کرنے کی اجازت دی جائے گی۔ دوسری طرف حکم میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ یقین دلایا گیا تھا کہ درخواست پر فیصلہ ہو گا کہ معروضات پیش کرنے کی اجازت تحریری معروضات پر یا زبانی معروضات پر دی جائے گی۔ اور بھی قصہ ختم۔ عدالت کے کھلے اجلاس میں دو بار یہ سنا گیا تھا کہ مجھے بولنے کی اجازت دی جائے گی۔ جیسے کہ یور لارڈشپس نے یہ موقع فراہم کیا ہے مجھ سے بھی وعدہ کیا گیا تھا۔ جسے پورا نہیں کیا گیا تھا اور پھر مائی لارڈز، ۹ اکتوبر کو سرسری طور پر درخواست ڈسمس کر دی گئی اور ۱۱ اکتوبر کو مقدمے کی کارروائی شروع کر دی گئی۔

گذشتہ روز یہ سوال اٹھایا گیا تھا کہ آخر کسی خاص نکتے کو ہائی کورٹ میں کیوں نہیں اٹھایا گیا تھا۔ ایسی کونسی جگہ ہے۔ جہاں ایسے مسائل اور نکات اٹھائے جا سکتے ہیں۔ اس نسبت سے، مائی لارڈز میں ایک بار پھر کٹہرے کی تعمیر کے بارے میں حوالہ دوں گا۔ اس

حقیقت سے قطع نظر کٹہرے کی تعمیر کسی طرح جائز نہیں تھی ۔ اور پھر مجھے اس کٹہرے کے پیچھے کھڑا کر دیا گیا ۔ ایک مرحلے پر میرا تاثر تھا کہ مسٹر جسٹس ینگ کے زمانہ میں ایک بار کٹہرا کھڑا کیا گیا تھا ۔ لیکن اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ لاہور ہائی کورٹ میں کبھی کوئی کٹہرا تعمیر نہیں کیا گیا صرف گواہوں کا ایک کٹہرا تعمیر کیا گیا تھا ۔ لیکن ان تمام چیزوں سے قطع نظر، ایک کٹہرا محض اس لیے کھڑا کیا گیا کہ وہ جسم کے درمیان حائل ہوں ۔

اور پھر یوں ہوا کہ میری بائیں طرف سپرنٹنڈنٹ پولیس بیٹھتا تھا ۔ (پہلے ایس پی زمان اور اس کے بعد ظفر اللہ) اور میری دائیں طرف انٹیلی جنس کا ایک افسر بیٹھتا تھا ۔ وہ سپیشل برانچ یا ڈی آئی جی سے تعلق رکھتا تھا ۔ وہ سراپا کان بن کر بیٹھتے تھے ۔ حتیٰ کہ اگر میں ۔ گڈ مارننگ یا السلام علیکم بھی کہتا تو وہ کان آگے کر لیتے ۔ ایک مرحلے پر جب میں ریکارڈ نمبر ۳۴۲ پر کچھ لکھ رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ وہ دونوں اس میں جھانک رہے ہیں ۔ حتیٰ کہ میں بیٹھ ، لکھ اور دستخط بھی نہیں کر سکتا تھا ۔ وہ دو گدھوں کی طرح تھے جو میرے دائیں بائیں بیٹھے رہتے تھے ۔ سب باتوں سے قطع نظر یہ دو گدھ ہر وقت میرے ساتھ رہتے تھے ۔ میں اپنے وکیل کے اتنا قریب نہ تھا کہ مقدمے کی سماعت کے دوران اسے کوئی مشورہ یا ہدایت بھی دے سکتا ۔

اس کی حقیقت کا اس واقعہ سے علم ہوتا ہے کہ جب میری بیوی پر ۱۶ دسمبر ۱۹۷۷ء کو قذافی سٹیڈیم پر لاٹھی چارج کیا گیا اور میں اپنے وکیلوں سے رابطہ کرنے کے لیے انتہائی کوشش کر رہا تھا تو میں ایسا نہ کر سکا ۔ میں مس طلعت یعقوب سے بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو وہاں موجود تھیں لیکن فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ میں جو کچھ کہہ رہا تھا وہ اسے سمجھ نہیں پا رہی تھیں ۔ کیونکہ میری آواز ان تک پہنچ نہ پا رہی تھی ۔ میں نے مسٹر اعوان کو متوجہ کرنے کی کوشش کی ۔ لیکن وہ میری آواز نہ سن سکے ۔ یہ اس بُعد اور فاصلے کی گرافک مثال ہے ۔ یہ جگہ وجود اور میرے وکلاء کے درمیان رکاوٹ تھی جس نے میرے لیے یہ ناممکن بنا دیا تھا کہ میں انہیں کسی قسم کی ہدایات دے سکوں ۔ جن کے بارے میں یور لارڈشپس نے بجا طور پر فرمایا ہے کہ ایسی ہدایات دی جانی چاہئیں تھی ۔

اس مرحلے پر آنریبل چیف جسٹس نے مداخلت کرتے ہوئے پوچھا ۔ کیا مسٹر بھٹو اس طرح

کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ جو مسٹر قصوری سے کی گئی جسے پچھلے دن عدالت میں زیر غور لایا گیا تھا۔ مسٹر بھٹو نے اس کا اثبات میں جواب دیا۔ جس پر آنریبل چیف جسٹس نے خیال ظاہر کیا کہ مسٹر بھٹو اپنے وکلا سے جیل میں ملاقات کرتے تھے۔ اور چونکہ یہ تصدیق بھی ہو چکی ہے کہ فلاں فلاں گواہ گواہی کے کٹہرے میں اگلے دن یا اس کے بعد کے دن لایا جائے گا۔ تو پھر یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ انہوں نے اپنے وکلا کو ضروری ہدایات دے دی ہوں گی۔

مسٹر بھٹو نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا، میں جو کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ مجھے معذور اور مجبور بنا دیا گیا تھا۔ مجھے غیر ضروری طور پر تکلیف پہنچائی جا رہی تھی۔ جو کہ اس عدالت کے آداب اور روایات کے مطابق نہیں تھا اور پھر اسی نکتے کی طرف آ رہا ہے۔ جس کی طرف یور لارڈ شپ سامنے لائے ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ میں ضروری ہدایات دے رہا تھا۔ لیکن جہاں تک اس ہدایات کا تعلق ہے۔ انہیں پسندیدہ اور مناسب حالات کے مطابق ہی دیا جا سکتا تھا۔ اس وقت کوئی شخص کسی معاملے پر کسی قسم کی ہدایات نہیں دے سکتا جب اس کے خیال میں یہ بات ایک شخص کے بارے میں راسخ ہو چکی ہو کہ وہ مسلسل اس پر الزامات لگائے چلا جا رہا ہے۔ ایسے خیال کے زیر اثر ممکن نہیں کہ بعض ایسی ہدایات بھی دی جائیں جن کا دیا جانا ضروری تھا۔ اگر الزامات ٹھوس بنیادوں پر استوار ہوتے تو پھر پہلے سے ان کا انسان کو علم ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ ٹھوس حقائق پر بنیاد نہیں رکھتے تھے انتہائی مضحکہ خیز، دلچسپ اور قیاسی باتیں کہی جا رہی تھیں۔ میں ان کے بارے میں پیشگی ہدایات نہیں دے سکتا تھا۔ اور پھر مائی لارڈز، اس رویے کے پیش نظر جو شکایت کنندہ نے جج کے درمیان اپنا رکھا تھا۔ اس کے تحت یہ بہت ضروری ہو گیا تھا کہ عین موقع پر ہدایات دے دی جاتیں۔ فوری طور پر ان نکات کی تردید کی جاتی جو اس کی قوت متخیلہ کی ایجاد تھے۔ اس طرح اس کی مکمل فریب کاری کی نشاندہی کی جا سکتی تھی۔ ایسا کرنے کے لیے میرے لیے بہت ضروری تھا کہ میں اپنے وکیل کے نزدیک ہوتا۔ اگر اس کے بیانات میں کسی قسم کی سچائی بھی ہوتی تو بلاشبہ مجھ سے یہ پوچھا جا سکتا تھا کہ میں نے اس کا پیشگی اندازہ کیوں نہیں لگایا تھا اور خصوصی ہدایات کیوں نہیں دی تھیں۔ اور اگر وہ بیانات ایسے نہیں تو پھر . . . . "

اس مرحلے پر مسٹر احمد رضا قصوری نے عدالت کی کارروائی میں مداخلت کرتے ہوئے شکایت کی ایک خاص شخص جوان کے پیچھے کھڑا ہے وہ انہیں ان کے وکیل سے باتیں کرنے سے منع کر رہا ہے اس پر مسٹر جسٹس نے مسٹر قصوری کو یاد دلایا کہ اگرچہ عدالت کو ان سے ان کی والدہ اور ان کے خاندان سے انسانی سطح پر بہت زیادہ ہمدردی ہے۔ اور حتیٰ اکہ مسٹر بھٹو بھی یہ کہہ چکے ہیں کہ جب ان کو اس سانحے کی خبر ہوئی جس میں ان کے والد فوت ہو گئے تھے تو انہیں بے حد افسوس ہوا تھا۔ اس کے باوجود ایک وکیل، ایک ذمے دار فرد اور ایک سابق پارلیمنٹیرین کی حیثیت سے مسٹر قصوری کے علم میں ہونا چاہیے کہ یہ ایک سرکاری مقدمہ تھا اور سرکار نے اس کے لیے دو انتہائی مناسب وکیلوں کی خدمات حاصل کی تھیں جو یہاں بیٹھے ہیں اور جو اس کیس پر سات ہفتوں تک اپنے دلائل پیش کرتے رہے ہیں۔ اس لیے اگر وہ اپنے جذبات اور احساسات پر قابو پائیں تو عدالت ان کی قدر کرے گی۔

اس کے بعد آنریبل چیف جسٹس نے استغاثہ کے وکیل آن ریکارڈ مسٹر ایس ایم رحمان سے استفسار کیا کہ کیا وہ مسٹر قصوری سے ہدایات لینے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ مسٹر رحمان نے انکار میں جواب دیا اور بیان کیا کہ وہ حکومت کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ مسٹر قصوری کی نہیں۔"

آنریبل چیف جسٹس نے مسٹر احمد رضا قصوری کو مطلع کیا کہ جو شخص ان کے پیچھے کھڑا ہے۔ وہ یہاں اس لیے موجود ہے کہ عدالت میں قانون کی عملداری رہے اور ان سے کہا کہ وہ مرحلے پر مداخلت کرنے سے احتراز کریں۔ کیونکہ اس سے کوئی مقصد پورا نہیں ہوتا۔ مسٹر قصوری کے جذبات کے لیے عدالت کی ہمدردی کو دہراتے ہوئے آنریبل چیف جسٹس نے ایک بار پھر یہ خیال ظاہر کیا کہ بطور گواہ مسٹر قصوری جو کچھ کہنا چاہتے تھے، اپنے کیس کے حق میں کہہ چکے یا الزامات لگا چکے ہیں مسٹر بھٹو کے وکیل کو ان پر جرح کرنے کا پورا اور مکمل موقع فراہم کیا گیا تھا۔ لیکن ایک ملزم کی حیثیت سے مسٹر بھٹو کا یہ حق ہے کہ وہ عدالت سے خطاب کر سکتے ہیں اور اس کے لیے دوسرے ملزموں نے درخواست کی ہے اور اصول کے تحت عدالت اس پر رضامند ہو چکی ہے کہ ان سب کو

چند منٹوں کے لیے باری باری بولنے کا موقع فراہم کیا جائے گا۔ اس کے بعد آنریبل چیف جسٹس نے مزید فرمایا کہ اگر مسٹر قصوری جذبات سے اتنے ہی مغلوب ہو چکے ہیں اور عدالت سے جانا چاہتے ہوں تو ان کے پیچھے کھڑا شریف آدمی ایسا کرنے میں ان کی مدد کرے گا۔ مسٹر قصوری کے پیچھے کھڑے سکیورٹی افسر اور محافظ گارڈ کو چیف جسٹس نے ہدایت دی کہ وہ مسٹر قصوری کی حرکات و سکنات اور تاثرات کی آزادی میں اس وقت تک رکاوٹ نہ بنیں جب تک وہ عدالت کی کارروائی میں مداخلت نہیں کرتے۔

مسٹر بھٹو نے بیان جاری رکھتے ہوئے کہا، میں نے بڑے خلوص قلب سے محمد احمد خاں قصوری کی وفات پر اپنے جذبات کا اظہار اس عدالت میں کیا تھا اور میں ایسا آدمی نہیں ہوں کہ اس موت پر جذبات کے بغیر تعزیتی ٹیلیگرام اس کے خاندان کو بھیجتا۔ جب یہ موت واقع ہوئی تو میں اور میری بیوی دونوں نے اس کے خاندان کے نام تعزیتی ٹیلی گرام بھیجے۔ مجھے یہ علم نہیں تھا کہ سب کچھ میرے اوپر ہی پھینک دیا جائے گا۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو میرے کزن ممتاز علی بھٹو تعزیت کے لیے بھی گئے تھے۔ مائی لارڈ بہر حال جذبات تو دونوں طرف ہیں۔ اِدھر بھی جذبات اور اُدھر بھی۔ اگر کسی شخص کو ایک جھوٹے اور خود ساختہ بنائے ہوئے مقدمے میں پھنسا دیا جائے اور اسے موت کی سزا سنا دی گئی ہو تو اس کے بھی جذبات اور محسوسات ہوتے ہیں۔

یور لارڈشپس اصل نکتے کی طرف آتے ہوئے میں عرض کروں گا کہ ایک مرحلے پر جب میں اپنے کٹہرے سے اٹھ کر مسٹر اعوان تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ انہیں شکایت کنندہ کے تضادات کے بارے میں بعض ضروری باتیں بتا سکوں۔ شکایت کنندہ گواہوں کے باکس میں تھا جو میری پارٹی کا رکن تھا اور میں اس کا وزیر اعظم تھا۔ تو وہ مڑا، میری طرف رُخ کیا اور کہا، پھر تم اپنا منہ بند رکھو۔ شٹ اپ۔ تمہیں عدالت میں بولنے کا کوئی حق نہیں۔ تم ملزم، قاتل، بیٹھ جاؤ۔ یہ واقعہ ہائی کورٹ میں ہوا۔ اب آپ دیکھیے کہ اگر عدالت میں اسے بتایا جاتا کہ وہ گواہوں کے باکس میں ہے۔ اور تمہیں مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں

ہے۔ اور اگر وہ ہدایات دینے کے لیے اُٹھا ہے تم اُسے ذلیل کرنے کے لیے چیخ نہیں سکتے۔ اسے ملزم اور مجرم کہہ کر نہیں پکار سکتے۔ یہ نہیں کہہ سکتے تم بدلہ لوگے۔

چیف جسٹس نے جو بات پوچھی وہ صرف اتنی تھی تمہارا مفہوم قصاص سے ہے" اس پر قصوری نے جواب دیا۔

"ہاں، مائی لارڈ، قصاص لیا جائے گا۔"

مسٹر رحمان نے اس نکتے پر مداخلت کرتے ہوئے بتایا کہ قصاص کے بارے میں بات اس کے بعد کہی گئی تھی۔ اور یہ بھی ریمارک دیا گیا کہ کٹہرا اس لیے بنایا گیا تھا کہ ۸ تاریخ کو مسٹر بھٹو کے مقدمے کی سماعت کے وقفے کے دوران میں پریس کانفرنس ہوئی اور مسٹر بھٹو کا اپنے وکیل کے ساتھ ہمہ وقت رابطہ قائم رہا۔

آنریبل چیف جسٹس نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ اس پوزیشن کی وضاحت پہلے بھی مسٹر بٹالوی، استغاثے کے سینیئر وکیل کر چکے ہیں اور صفائی کے وکیل مسٹر یحییٰ بختیار بھی اس کی بات کر چکے ہیں۔ اب اس میں کچھ بھی نکالا نہیں جا سکتا۔ ہز لارڈشپ نے بعد میں یہ بھی رائے دی کہ کیا قانون میں کوئی اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ حتیٰ کہ انگریزی ترکیب "اب تم کٹہرے میں ہو۔" (NOW YOU ARE IN DOCK) بھی ایک نوعیت کا محاورہ ہے۔ اور اس کا صرف یہ مطلب ہے کہ وہ شخص جس سے خطاب کیا گیا تھا اس پر اعتراض کیا ہی جانا تھا اور وہ کسی نہ کسی بات کے لیے جواب دہ بھی تھا۔ ہز لارڈشپ نے اس میں اضافہ کیا کہ یہ قطعی طور پر ممکن ہے کہ مسٹر بھٹو کے جذبات ضرور مجروح ہوئے رہوں گے۔"

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو:۔ مائی لارڈ، میں یقین دلا چکا ہوں کہ آج اپنی معروضات مکمل کر دوں گا۔ لیکن اگر اس طرح کی مداخلتوں سے اگر تبدیلیاں ہوتی رہیں تو...... انگریزی زبان استعارے کے اعتبار سے بہت وسیع ہے۔ لیکن اگر آپ اسے ایک لغوی اور لفظی معنوں تک ہی گھٹا دیں گے، جیسا کہ آپ کر رہے ہیں تو پھر اس سے بہت زیادہ وقت غیر ضروری طور پر ضائع ہوگا۔

آنریبل چیف جسٹس نے دوبارہ اپنی رائے کا اظہار کیا کہ اس وقت یقیناً مسٹر بھٹو کو ضرب محسوس ہوئی ہوگی اور طیش میں آگئے ہوں گے۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو: مائی لارڈ میں اپنا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ مجھے بعض اہم باتیں کہنی ہیں۔ میں اس سوال میں جانا نہیں چاہتا کہ یہاں میں یہ کہوں گا اور اس لیے نہیں کہ یہ سوال میری اہمیت سے تعلق رکھتا ہے۔ بلکہ اس لیے کہ یہ سچائی کا سوال ہے کہ میں کوئی پریس کانفرنس نہیں بلوائی۔ مائی لارڈ میں وہیں بیٹھا تھا جہاں مجھے بیٹھنے کے لیے کہا گیا تھا۔ ورنہ دوسری صورت میں مجھے فی الفور دوسرے کمرے میں لے جایا جاتا وہی ایس پی حضرات وہاں موجود تھے۔ اور مجھے وہاں سے جانے کے لیے نہیں کہا گیا تھا۔ میں جہاں تھا۔ وہیں اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اور مجھے چلنے کے لیے نہیں کہا گیا تھا۔ اور پھر یوں ہوا کہ کچھ غیر ملکی اور پاکستانیوں کا وہاں سے گزر ہوا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں کیا محسوس کر رہا ہوں اور کچھ ایسی نوعیت کے سوال پوچھے۔ یہ عام گفتگو انہوں نے اخبارات میں دے دی۔ مجھے یہ بھی علم نہیں تھا کہ وہ پریس کے نمائندے ہیں۔ اور پریس کے نمائندوں کی کثرت ہے۔ اگر اب کوئی آتا ہے اور میری صحت کے بارے میں پوچھتا ہے تو قدرتی امر ہے کہ میں اسے جواب دوں گا۔ ایسا بالکل نہیں ہوا کہ میں نے پریس کانفرنس بلوائی ہو۔

اپنے دلائل کو جاری رکھتے ہوئے مائی لارڈز کہوں گا بعض فنی حربے اختیار کر کے عدالت کی کارروائی میں رخنہ اندازی کی گئی۔ میں یہ کہوں گا کہ لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس میرے خلاف کینہ رکھتے تھے۔ اور میرے خلاف تعصب رکھتے تھے۔ حالانکہ اس معاملے میں کسی قسم کی دشمنی یا تعصب کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اب میں ان معروضات کو دہرانا نہیں چاہوں گا جو مسٹر یحیٰی بختیار پہلے ہی پیش کر چکے ہیں۔ لیکن میں اس حوالے سے یہ کہوں گا کہ اس میں مسٹر یحیٰی بختیار کو ان معنوں میں اس معاملے میں ملوث کیا گیا ہے اور ان سے یہ منسوب کیا گیا ہے کہ انہوں نے میرے ذہن میں چیف جسٹس کے خلاف زہر بھرا۔

مائی لارڈ! میں مسٹر یحییٰ بختیار کا بے حد احترام کرتا ہوں۔ میرے لیے بھائی کی طرح ہیں۔ لیکن میں یہ سوال پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا مسٹر یحییٰ بختیار میری کابینہ کے رکن تھے؟ یا میں مسٹر یحییٰ بختیار کی کابینہ کا رکن تھا کہ میں اس حد تک ان کے اثر میں آجاؤں؟ میں ان کا وزیر اعظم تھا۔ وہ میرے اٹارنی جنرل تھے۔ وہ میرے وزیر اعظم نہیں تھے اور میں ان کا اٹارنی جنرل نہیں تھا کہ میں ان کے ہاتھوں کی اس طرح کٹھ پتلی بن جاتا۔ ایک ایسے بنیادی مسئلے پر میں فطری طور پر اپنی قسمت اور اپنے مستقبل کا خود فیصلہ کروں گا۔ میں فطری طور پر اپنے ایک معاملے میں جس میں میری زندگی، میرا وقار، میری عزت، میری شہرت، میرا سیاسی کیریئر ملوث ہیں۔ میں خود ہی فیصلہ کروں گا۔ اس لیے میں نہیں چاہتا کہ مسٹر یحییٰ بختیار کو غیر ضروری طور پر اس معاملے میں کیوں شامل کر لیا گیا۔! یہ مسٹر یحییٰ بختیار کے ساتھ انصاف نہیں ہے کہ انہیں ان تمام باتوں کا ذمے دار قرار دیا جائے۔

اس نکتے پر ایک آنریبل جج نے خیال ظاہر کرتے ہوئے بتایا "حقیقتاً مسٹر یحییٰ بختیار نے خود یہ مشورہ مسٹر بھٹو کو دیا تھا۔ لیکن اس مشورے کو قبول کیا گیا یا نہیں یہ ایک دوسرا سوال ہے۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو: سر، ایک اچھے منتظم کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ اسے دیے جانے والے نوے فیصدی مشوروں کو مسترد کر دیتا ہے۔ اس لیے مائی لارڈ، مسٹر یحییٰ بختیار کے معاملے میں یہ معروضات تھیں۔ یہ اخلاقی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی تھی کہ میں اس معاملے میں ان کی صفائی پیش کروں۔

"اب جہاں تک میری اپنی پوزیشن کا تعلق ہے میں نے یہاں انتہائی اخلاق کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں مستحکم شرائط پر، سابقہ وزراء، سابق وزیر قانون شیخ خورشید کا حوالہ پیش کر سکتا ہوں۔ جو اگرچہ فوت ہو چکے ہیں۔ تعصب کے اس موضوع پر میں سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس طفیل عبدالرحمان کا حوالہ دے سکتا تھا۔ اگر میں تاریخ کی زمانی ترتیب میں جانا چاہتا تو میں اس کا آغاز ۱۹۶۳ء سے کرتا۔ جب چیف جسٹس، لا سیکرٹری بھی تھا۔ جب ایک بہت اہم صورتِ حال ڈھاکہ میں پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن میں نے

اس کا ذکر نہیں کیا۔ کیونکہ میں نے سوچا کہ اب یہاں ۱۹۶۳ء میں جانے کی کیا ضرورت ہے! جبکہ مناسب مواد رسائی میں ہے۔ ریکارڈ میں اتنا کچھ کافی ہے۔ جس سے میرے نکتے کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ پھر بھلا ۱۹۶۳ء میں ڈھاکہ میں ہونے واقعات کے ذکر کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے؟

بہرحال، مائی لارڈ کچھ بھی ہو، ۱۹۶۳ء کے ڈھاکہ اور اس حقیقت میں کہ اسی چیف جسٹس کی عدالت میں میری نظر بندی کا مقدمہ پیش ہوا میں ایک تعلق ہے۔ میں اسے اتفاقیہ امر ہی سمجھنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس وقت ہائی کورٹ میں ۱۹۶۳ء میں کم از کم ۲۵ جج ضرور ہوں گے۔ ان ۲۵ ججوں میں یہ چیف جسٹس تھے۔ جنہوں نے کیمپ جیل لاہور میں میرے مقدمے کی بند اور خفیہ سماعت کی۔ میرا خیال ہے کہ کمرے کے لیے مجھ بے حد کشش ہے۔ اس کے بعد پھر میری سماعت بند مقدمے میں ہوئی۔ بلاشبہ جناب والا، ۱۹۶۳ء میں میں درخواست گزار تھا۔ لیکن جو بنچ تشکیل دیا گیا، اس کا سربراہ چیف جسٹس بنایا گیا۔ کیونکہ ڈھاکے ۱۹۶۳ء کے واقعے کو سامنے رکھا گیا تھا۔ اور تب بھی، سماعت کے پہلے دن ہی ایک ناخوشگوار بحث شروع ہو گئی۔ تب میں ایک جوان آدمی تھا۔ مسٹر جسٹس مشتاق حسین نے جو ریمارک دیے تھے۔ ان پر میں عدالت کے کمرے سے باہر چلا گیا۔ میرے وکیل محمود علی قصوری مجھے دوبارہ عدالت میں واپس لائے تھے۔

اس مقدمے کا فیصلہ بھی عدالت نے نہیں کیا تھا۔ اور مجھے عوام کے اس شدید مطالبے کے تحت کہ تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا جائے۔ مجھے رہائی ملی۔ اس میں شیخ مجیب الرحمان بھی شامل تھے۔ جن پر سازش کا مقدمہ چل رہا تھا۔ پوائنٹ یہ ہے کہ میں نے یہ تمام چیزیں بھی ابھی کسی درخواست میں بیان نہیں کیں۔ کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ انہیں بھول جانا ہی بہتر ہے

اب ہم اس ریزولیشن کی طرف آتے ہیں۔ جسے پاکستان پیپلز پارٹی کی مرکزی مجلس عاملہ نے ۳ اگست ۱۹۷۷ء کو منظور کیا گیا تھا۔ مائی لارڈ، اس وقت اگرچہ یہ تحقیقات شروع ہو چکی تھیں۔ لیکن ہم لاعلم تھے کہ ایک فوجداری مقدمہ میرے خلاف تیار کیا جا رہا ہے۔ اگر ہم یہ کہتے تھے۔ ہم یہ جانتے بھی تھے تو بھی ہم یہ نہیں جان سکتے تھے۔ مقدمہ کس کی عدالت میں چلے گا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ مقدمہ جسٹس مشتاق حسین اور دوسرے چار ججوں نے

نہیں سُنا ۔ بلکہ اس کی سماعت ہائی کورٹ کے دیگر دو ججوں نے کی تھی ۔

یہ جانے بغیر یا اس حوالے سے کہ یہ کیسے کہا جا سکتا تھا کہ جسٹس مشتاق حسین مجھ پر قتل کے مقدمے کی سماعت کریں گے ۔ اگر یہ جانے بغیر اس حوالے سے مرکزی مجلس عاملہ نے یہ ریزولیوشن بھی منظور کر دیا گیا کہ ہمیں جسٹس مشتاق حسین کی غیر جانبداری پر اعتماد نہیں ۔ جو کہ اس وقت چیف الیکشن کمشنر مقرر ہو چکے تھے ۔ اس لحاظ سے ہم ان کی غیر جانبداری پر اپنے خیالات کا اظہار کر چکے تھے ۔

مرکزی مجلس عاملہ کے ریزولیوشن کے جواب میں جسٹس مولوی مشتاق حسین نے ایک پریس کانفرنس بلوائی ۔ اور کہا کہ وہ اس فریقین کے ساتھ اس موضوع میں جانا نہیں چاہتے اور نہ ہی ان سے مذاکرات کرنا چاہتے ہیں ۔ سوال تو یہ ہے کہ پیپلز پارٹی مذاکرات چاہتی ہی نہیں تھی ۔ کسی قسم کے مذاکرات کے لیے کہا ہی نہیں گیا تھا ۔ ہم نے صاف اور سیدھے الفاظ میں کہا تھا کہ ہمیں بطور چیف الیکشن کمشنر ان کی غیر جانبداری پر اعتماد نہیں ۔ اس لیے جو جواب دیا گیا اس میں اصل مسئلے کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ۔

اس کے بعد میں مسٹر پیرزادہ نے جو کچھ مجھے کوٹ لکھپت جیل میں جسٹس مشتاق حسین کے متعصبانہ اور مخالفانہ حملوں کے بارے میں بتایا تھا ۔ میں یہ کہوں گا کہ گذشتہ روز میں نے مسٹر جسٹس نسیم حسین شاہ نے جو کچھ فرمایا تھا ۔ اسے قبول کر لیا تھا ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسٹر پیرزادہ اس سلسلے میں ایک بیان حلفی تیار کر کے داخل کرنا چاہتے تھے لیکن یہ میں تھا جو نہیں چاہتا تھا کہ بیان حلفی داخل نہ کیا جائے ۔ میں جو دکھانے کی کوشش کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ مقدمے کے آغاز سے پہلے یہ سب واقعات ہو چکے تھے ۔ ہمیں یہ معلوم ہی نہیں ہوا تھا کہ مقدمہ چلایا جانے والا ہے تو یہ سب واقعات ہو چکے تھے ۔ اور ہمیں یہ علم نہیں ہوا تھا کہ جسٹس مشتاق حسین ایک بنچ تشکیل دے رہے ہیں اور وہی اس کے سربراہ ہوں گے ۔

تب مائی لارڈ، ۵ نومبر ۱۹۷۷ء کو ایک درخواست داخل کی ۔ جو اس پریس کانفرنس کے حوالے سے تھی جو قائم مقام چیف جسٹس نے مقدمے کے بارے میں کی تھی ۔ یہ

درخواست ریکارڈ میں موجود ہے اور اس کا معائنہ کر چکے ہیں۔ اس لیے میں صرف ایک پوائنٹ پر ہی بات کروں گا کہ یہ ایک غیر معمولی بات ہے کہ کوئی پریزائیڈنگ جج کسی بھی حوالے سے کسی ایسے مقدمے کے بارے میں پریس کانفرنس بلائے۔ جو اس کے سامنے سماعت کے لیے پیش ہو۔

تاہم جس بات کا ذکر میں یور لارڈشپس کے سامنے کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ اس پریس کانفرنس میں چیف جسٹس نے پورا یقین دلایا کہ مقدمے کی سماعت کھلے اور عام اجلاس میں ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ مجھ پر مقدمہ دن کی پوری روشنی میں مروّجہ قانونی روایات کے تحت چلایا جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ حفظِ ماتقدم کے طور پر یہ انتظام کر لیا گیا ہے کہ مقدمے کی کارروائی ریٹیپ کی جائے۔ اور مجھے یہ دو بار موقع فراہم کیا گیا ہے کہ میں سماعت کے انتظامات کی تصدیق کر سکوں۔ حقیقت یہ ہے کہ واقعتاً یہ غلط ہے۔ کیونکہ ٹیپ کو میرے سامنے نہیں چلایا گیا تھا۔ چیف جسٹس نے اس خواہش کا بھی اظہار کیا کہ ایمنسٹی انٹرنیشنل وہاں آئے اور آ کر دیکھے کہ مقدمہ پورے انصاف کے ساتھ چلایا جا رہا ہے۔

اس پریس کانفرنس کے پیشِ نظر میں یہ پوچھنا اور جاننا چاہوں گا کہ پھر کیسے اور کیوں خفیہ مقدمہ چلایا گیا؟ یہ بھی تو ہے کہ میں نے استغاثے کو دو، ڈھائی یا تین مہینے تک سنا۔ ڈھائی یا تین مہینوں تک میں خاموش بیٹھا رہا۔ اور جب میری باری آئی۔ جب صفائی پیش کرنے کا میرا موقع آیا تو پھر مقدمے کی سماعت کو ظالمانہ اور یک طرفہ طور پر بند اور خفیہ سماعت کے کمرے میں تبدیل کر دیا گیا۔

اس سلسلے میں دلیلیں اور وجوہات بیان کی گئی ہیں۔ پہلی دلیل — قانونی دفعات کا اختیار، لیکن قانونی دفعات کا استعمال جوڈیشنل تقاضوں کے مطابق کیا جاتا ہے۔ ان کا یک طرفہ اور ظالمانہ استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ان کو ظالمانہ اور یک طرفہ طور پر ہی استعمال کیا جاتا ہے تو پھر قانونی دفعات کے تحت اختیارات کی کوئی وقعت نہیں رہ جاتی۔ پھر قانونی اور غیر قانونی میں کیا فرق باقی رہ جاتا ہے۔ ایسے کسی حکم کو عمل میں لانے سے پہلے عدالت کو اس کی معروضی ضرورت دیکھ کر حکم جاری کرنا چاہیے تھا۔ کہ آیا اسے

جائز اور قانونی بنیادوں پر منظور کیا گیا ہے یا نہیں؟

لیکن ہائی کورٹ نے اس سلسلے میں کیا وجوہات پیش کیں۔ کہا گیا ہے کہ یہ خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ میں عدالت کو رسوا کروں گا۔ اور اس کے خلاف انتہائی مذموم الزامات لگاؤں گا۔ سپریم کورٹ کے سامنے میری معروضات یہ ہیں کہ یہ وجوہات قطعی طور پر موہوم ہیں۔ اگر میں بعض انتہائی گھٹیا اور رسوا کن الزامات لگانا چاہتا تھا تو بھی عدالت کو اس سے کوئی نقصان نہ پہنچ سکتا تھا۔ اس سے کہیں زیادہ نقصان اور کہیں زیادہ رسوا مقدمے کی سماعت کو خفیہ سماعت میں بدل کر پہنچایا گیا۔ اس لیے عدالت نے یہ قدم اٹھا کر کچھ فائدہ حاصل نہیں کیا۔ عدالت نے اس سلسلے میں میرا منہ بند کر کے بہت کچھ کھو دیا۔

مائی لارڈ، چیف جسٹس کے تعصب سے قطع نظر، جو عدالت کے سامنے ریکارڈ کرایا گیا، جب مقدمے کا آغاز ہوا تو یہ بات انتہائی قابل ذکر ہے کہ چیف جسٹس ہی ایک اعتبار سے میرے خلاف ایک تحقیقاتی ایجنسی بن گئے اور مقدمے کی تمام تر سماعت کے درمیان ان کا یہی رویہ رہا۔ جب مشترکہ ملزموں میں سے ایک نے اٹھ کر، مقدمے سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھنے والے موضوع پر، کچھ بموں اور دھماکہ خیز مواد کے بارے میں بیان دیا جو کہیں اس ارادے سے رکھا گیا تھا کہ ان سے جماعت اسلامی کے ہیڈ کوارٹر کو اڑا دیا جائے گا۔ تو عدالت نے فی الفور تحقیقاتی افسر کو یہ اجازت دیدی کہ وہ جا کر اس معاملے میں تحقیقات کریں۔

میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ کس طرح اس کی ذمے داری تھی، کیسے یہ اس کا منصب تھا کہ جو میرے مقدمے کا فیصلہ کرنے والا تھا۔ جو اس سلسلے میں آخری فیصلہ دینے والا تھا کہ وہ ایک تحقیقاتی افسر بن جائے اور اس قسم کی تحقیقات کا حکم جاری کرے جب کہ وہ اس مقدمے کی سماعت کر رہا تھا؟ وہ یہ کر سکتا تھا کہ وہ مشترکہ ملزم کے وکیل کو ہدایت دے سکتا تھا کہ وہ اپنے موکل سے کہے کہ اس ضمن میں ایف آئی آر کا اندراج کرائے۔ جیسا کہ یور لارڈشپس نے سپریم کورٹ میں ایسا کیا۔ جبکہ میں نے ایسے ہی امور کا حوالہ دیا تھا۔ جو آئینی درخواست سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ یور لارڈشپس نے کہا

تھا کہ یہ ہمارے سامنے نہیں ہیں۔ آپ دوسری عدالت میں جا سکتے ہیں۔ آپ مناسب طریقے سے یہ کر سکتے ہیں۔ لیکن مقدمہ چلانے والی عدالت نے ایسا نہیں کیا۔

اب، مائی لارڈ قطع نظر اس کے کہ چیف جسٹس میرے خلاف ایک تفتیشی افسر بن گئے تھے۔ یہ بھی ریکارڈ پر ہے کہ چیف جسٹس میرے خلاف شکایت کنندہ بھی بن گئے مائی لارڈ بات یہ ہے کہ بعض اوقات الفاظ ہلکے پھلکے انداز میں بولے جاتے ہیں۔ جب میں نے جسٹس رضوی کا حوالہ دیا تو لفظ جسٹس کے بجائے چیف جسٹس منہ سے نکل گیا۔ اور پھر چیف جسٹس بھی تو اپنے بارے میں حوالہ دیتے ہوئے کہتے تھے۔

"ابھی چیف جسٹس کا وقت نہیں آیا تھا۔"

ان کے چہرے پر ایک مسکراہٹ دیکھنا بہت ہی خوشگوار منظر تھا۔ کیونکہ وہ پہلی بار مسکراہٹ دکھائی دی تھی۔ اس لیے میں نے بھی از راہ لطف کہا "آپ کا بھی آئے گا"

آنریبل چیف جسٹس نے یہاں رائے دی کہ مسٹر بھٹو نے گذشتہ روز انہیں بھی بتایا تھا کہ ان کا وقت بھی آئے گا۔ لیکن انہوں نے اس کا برا نہیں منایا اور نہ ہی اس کے خلاف کوئی شکایت درج کی ہے۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو:۔ نہیں مائی لارڈ، اگر اسے غلط سمجھا گیا ہے تو میں سب سے پہلے اس کی معذرت چاہتا ہوں۔ یہ تو از راہ مذاق تھا۔ اور پھر میں نے یہ بات مارشل لا کے حوالے سے کہی تھی۔ آپ جانتے ہیں کہ بہت پہلے میں نے عزیز احمد سے کہا تھا۔ میں نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ اگر ایک اور مارشل لا لگ گیا تو، یہ تیسرا مارشل لا ہے .... تو یہ ہمیں پارہ پارہ کر دے گا۔ اور ہمیں تباہی کے کنارے تک لے جائے گا۔ میں نے کہا تھا کہ چوتھا مارشل لا اس ملک کا خاتمہ کر دے گا۔ اور میں نے یہ بات انہی معنوں میں کہی تھی جن معنوں میں میں نے گذشتہ روز یہ کہا تھا کہ حتیٰ کہ مارشل لا ججوں کو بھی نہیں بخشے گا۔

لیکن چیف جسٹس کی طرف آتے ہوئے میں کہہ رہا تھا کہ میں نے بڑے خوشگوار انداز میں کہا تھا۔

"آپ کا بھی وقت آئے گا۔ مسلمانوں کا سب کا وقت آتا ہے۔"

وہ طیش اور غضب میں آ گئے۔ انہوں نے ڈیوٹی پر موجود ایس پی ظفر اللہ سے کہا کر وہ میرے خلاف ایک شکایت درج کرائے۔

مائی لارڈ، ایک چیز جس کا میں یہاں ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے ایسے کئی احکام منظور کئے تھے۔ جن میں میرے استعمال کردہ لفظ "FABRICATED" کو جسے اس کیس کے حوالے سے کہا گیا تھا۔ واوین میں لکھا گیا۔ سوال یہ ہے مائی لارڈ کہ ایک شخص اس وقت تک بے خطا اور بے قصور ہوتا ہے۔ جب تک اس کے خلاف ثبوت پیش نہیں کر دیا جاتا۔ اس لیے اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ مندرجہ جھوٹا، جعلی اور خود ساختہ ہے۔ جب تک کہ اس کا الٹا ثبوت پیش نہ کرایا جائے۔

ایسی صورت میں شک کا فائدہ ہمیشہ استغاثے کو دیا جاتا ہے۔ جب بات شہادتوں کی ہوتی ہے تو ہمیشہ استغاثے کی شہادتیں سمجھا جاتا ہے۔ خواہ استغاثہ اپنے کیس کو ثابت کر سکے یا نہیں اس لحاظ سے لفظ FABRICATED کو واوین میں لکھنا اگر سرکار کے انحراف کا نہیں تو اس کے اور ٹرائل کورٹ کے رویے کا ثبوت ضرور پیش کرتا ہے۔

مائی لارڈ، میں اگلا نکتہ "اپنی علالت کے بارے میں ہے۔ ۱۱ر نومبر کو میں بیمار ہو گیا میری میڈیکل ہسٹری کو سب جانتے ہیں۔ ماضی میں جو ڈاکٹر میرا علاج کرتے رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ مجھ پر انفلوئنزا اور ملیریا کا حملہ ہوا تھا۔ میں ایک دیہاتی آدمی ہوں اس لیے مجھے مچھر کاٹتے ہیں۔ ملیریا کی تکلیف مجھے بہت پرانی ہے۔ ملیریا اور انفلوئنزا کے حملوں کی وجہ سے مجھے کولون کی تکلیف لاحق ہو جاتی ہے اور مجھے ناکارہ کر دیتی ہے۔ اکثر یہ کہا گیا ہے کہ اگر نپولین کی کولون کی تکلیف میں اضافہ واٹرلو کے میدان میں نہ ہوا ہوتا تو وہ واٹرلو کی جنگ جیت سکتا تھا۔

کولون کی یہ تکلیف بعض افراد پر عجیب انداز سے اثر کرتی ہے۔ بعض اوقات یہ جلد ہی ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن بعض اوقات یہ بالکل ناقابل برداشت ہو جاتی ہے اور اسے رفع ہونے میں خاصا وقت لگتا ہے۔ اس خاص موقع پر مجھ پر ملیریا، انفلوئنزا اور اس کولون کی تکلیف نے مجھ پر ہلہ بول دیا تھا اور پھر مجھے ایک ایسے کمرے میں مقفل کیا گیا تھا۔

جو میری صحت یابی کے لیے رکاوٹ تھا۔ یہاں ایک کھلا روشندان تھا اور سردیوں کا موسم تھا۔ سردی اور ہوا کے سامنے پڑا تھا۔ جس نے میری حالت کو مزید خراب کر دیا۔ میرا درجہ حرارت ۱۰۲ - ۱۰۳ تک پہنچ گیا۔ میں فی الواقع بہت بری حالت میں تھا۔

میری علالت کے پیش نظر مقدمے کو دو دنوں کے لیے ملتوی کرنے کی اجازت دی دی گئی۔ لیکن میری خراب اور ابتر حالت کے پیش نظر ان دنوں کے التوا کی کوئی اہمیت نہ تھی پھر عدالت کی طرف سے کہا گیا کہ ایک مزید دن کی اجازت دی جاتی ہے۔ مائی لارڈ مجھے اپنی صحت کی بحالی کے لیے وقت کی ضرورت تھی۔ مزید ایک دن اس کے لیے کافی نہیں تھا۔ نہ صرف میرا ذاتی معالج، بلکہ جیل کے ڈاکٹروں اور سپرنٹنڈنٹ نے کہا تھا کہ میں اس قابل نہیں تھا کہ عدالت میں حاضر ہو سکوں اور یوں کیس میری عدم موجودگی میں ہی سنا گیا۔ اس کی کارروائی جاری رکھی گئی اور پندرہ اہم ترین گواہ، جن میں ولیش اصغر، اور وکیل خاں بھی شامل تھے کا بیان لیا گیا اور ان پر جرح میری عدم موجودگی میں کی گئی۔ جب کوئی بیمار ہو تو پھر اس کے لیے ہدایات دینا بہت ہی مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان گواہوں کو نہ صرف میری عدم موجودگی میں سنا گیا بلکہ میری ہدایات کے بغیر ان کی سماعت کی گئی۔

جب بہت سے گواہوں کی شہادت میری غیر حاضری میں ہو چکی تو چیف جسٹس نے مسٹر اعوان سے پوچھا کہ اب میری طبیعت کیسی ہے؟ مسٹر اعوان نے بتایا کہ میں بہت کمزور ہو چکا ہوں اور اغلباً میں ۶ تاریخ کو عدالت میں حاضر ہو سکوں گا۔ اس وقت یہ ہوا کہ عدالت نے ایک میڈیکل بورڈ کی تشکیل کی اور وہ مجھے دیکھنے کے لیے آئے اس وقت تک میں مسٹر اعوان کو بتا چکا تھا کہ میری صحت بحال ہو رہی ہے۔ کیونکہ میرا بخار جا چکا ہے۔ لیکن میں بہت زیادہ نقاہت محسوس کر رہا تھا۔ میں گھومنے کے لیے صحن میں بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اس لیے مجھے تھوڑا وقت چاہیے کہ میں اپنی توانائی بحال کر سکوں۔ تاکہ میں اپنے فرائض بخوبی انجام دے سکوں۔

آخر، یہ تو میں دیکھ ہی چکا تھا کہ جب میری استعداد مفلوج ہوئی تو کیا ہوا تھا اور

پھر مسٹر جسٹس منیر اور مسٹر جسٹس کیانی کے فیصلہ کے مطابق ان کے الفاظ ہیں میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ دونوں طرف کی استعداد کارکردگی مفلوج ہو جائے۔ لیکن جب حکومت کے حکام کا تشکیل کیے ہوئے میڈیکل بورڈ نے خلاف رائے دی تو میں نے کہا میں بالکل ٹھیک ہوں اور میں عدالت میں حاضر ہونے لگا۔

لیکن جب میں عدالت میں حاضر ہوا تو کیا واقعہ پیش آیا۔ میں ۶ تاریخ کو عدالت میں حاضر ہوا، ۷ تاریخ کو عدالت نے حکم جاری کیا کہ اب سے عدالت کا اجلاس صبح ۸ بجے سے ساڑھے ۸ بجے شام تک ہر روز بشمول جمعرات ہوا کرے گا۔ اور کیس کی سماعت آئندہ سے ان اوقات پر جاری رہے گی۔ مائی لارڈ، میں تب کوٹ لکھپت جیل میں تھا۔ تمام تر حفاظتی انتظامات کے ساتھ کوٹ لکھپت جیل سے عدالت تک پہنچنے میں ایک گھنٹہ صرف ہوتا تھا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ صبح چھ بجے اُٹھا جائے اور کوٹ لکھپت جیل ساڑھے پانچ بجے واپس پہنچا جائے۔ ایک تھکا دینے والے دن کے بعد جس میں دوپہر کے کھانے کا وقفہ بھی نہیں تھا۔ ان حالات میں مجھ سے کیسی ہدایات دینے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ جبکہ میں پچھلے تین ہفتوں سے شدید علیل بھی تھا۔ میں یہ اندازہ لگانے میں ناکام رہا ہوں کہ ہم نے کونسا ایسا جرم کیا تھا کہ جس کی سزا میں عدالت نے یہ غیر معمولی قدم اُٹھایا تھا۔ جب میرے وکیل نے یہ درخواست پیش کی کہ عدالت کا اجلاس معمول کے اوقات کے مطابق کر دیا جائے تو یہ درخواست اس کے منہ پر دے ماری گئی۔ نہ اسے دیکھا گیا نہ اس پر توجہ دی گئی اور یہ کہا گیا کہ یہی اوقات جاری رکھے جائیں گے۔

اس میں دلچسپ چیز یہ ہے کہ میں عدالت کی سپرداری میں نہیں تھا۔ جب کبھی چیف جسٹس کو یہ سوٹ کرتا وہ مجھے اپنی سپرداری میں لے لیتے۔ جب سوٹ نہ کرتا تو اس کا رویہ مختلف ہوتا۔ جب میں نے اپنی بیوی اور بیٹی سے ملاقات کے لیے درخواست کی تو مجھے بتایا گیا کہ یہ ان کے دائرہ کار میں نہیں۔ ہم اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے لیکن جب مجھے ایذا اور سزا دینا مقصود تھا تو چیف جسٹس نے کوٹ لکھپت جیل کے ڈی ایس پی کو حکم دیا کہ وہ ہر روز میرے ساتھ آئے۔ تاکہ مجھے موقع پر ہی جیل کے قوانین کے تحت

اگر میں عدالت کی توہین کروں یا کوئی ایسی چیز تو بروقت وہیں سزا دے سکیں اور کوئی شخص کس طرح توہین کا ارتکاب کرتا ہے؟ چیف جسٹس کی طرف نگاہ ڈالنے سے۔ چیف جسٹس کو دیکھنے سے ....

آنریبل چیف جسٹس نے یہاں خیال کا اظہار کیا کہ ایسا مسٹر بھٹو کو نہیں کہا گیا تھا۔ بلکہ مسٹر اعوان کو کہا گیا تھا جنہوں نے اپنی صفائی پیش کر دی تھی۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو:- مائی لارڈ، یہ مجھے نہیں کہا گیا تھا۔ لیکن اس سے ایک نظیر قائم کر دی گئی تھی۔ کیونکہ اگر توہین کی یہی تعریف اور تشریح ہے تو پھر کسی بھی شخص کے لیے انتہائی دشوار ہے کہ وہ توہین کا ارتکاب نہ کر سکے۔

مائی لارڈ، میرا اگلا پوائنٹ - اس مسئلے سے ہے کہ کیا ہمیں بولنے کا موقع فراہم کیا جائے یا نہیں؟ - یہ مسئلہ ۶ دسمبر کو پیدا ہوا تھا۔ جب یہ بحث ہوئی کہ کیا مسٹر جسٹس شفیع الرحمان کی رپورٹ کو شہادتوں کو شامل کیا جائے یا نہیں؟ اس لیے یہ ایک بہت اہم مسئلہ تھا۔ اس لیے ہم اس پر غور کرنا چاہتے تھے۔ ہمیں عدالت کی طرف سے کہا گیا کہ ہم کاریڈور میں جا کر اس پر تبادلہ خیالات کر سکتے ہیں۔ ہم باہر گئے۔ لیکن دو منٹوں کے بعد واپس آ گئے۔ کیونکہ وہاں ایف آئی اے کے آدمیوں کا ہجوم تھا۔ اور وہاں گفتگو کسی طرح ممکن نہیں تھی۔

مائی لارڈ، یہاں میں ان چیزوں کے بارے میں بھی صفائی پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جن کے بارے میں ہائی کورٹ کے احکام میں کہا گیا ہے۔ ان احکام میں سے ایک میں کہا گیا ہے کہ ایک مرحلے پر جب میں بول رہا تھا تو میں نے کہا کہ مجھے مقدمے کے آغاز سے ہی توہین کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اور ان اہانتوں اور بے عزتیوں کا بدلہ لیا جائے گا اور یہ بھی کہا گیا کہ میں نے یہ کہتے ہوئے میز کو بجایا تھا۔ مائی لارڈ میں ایسا شخص نہیں ہوں کہ جو کسی ایسی چیز سے انکار کرے جو درست ہوں اور امر واقعہ ہو۔ میری رائے میں مائی لارڈ یہ مسئلہ شدید حساسیت کا نہیں تھا۔ سیاست میں کوئی شخص شدید حساس نہیں ہو سکتا۔ مسئلہ صاف تھا کہ ایسی اہانتیں کی گئیں۔ اور یہ ہر شخص کا ذاتی انداز اور مسئلہ ہے کہ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اسے اہانتوں کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اگر کوئی بے چارہ محروم اور نادار شخص

اپنی پیدائش سے ہی بے عزت کیا جاتا رہا ہے تو پھر اہانتوں کو قبول کرنے میں اس کی سطح مختلف ہو گی۔

یہ ہماری سوسائٹی کی بدقسمتی ہے۔ اور ہر سوسائٹی میں ایسے لوگ اپنا وجود رکھتے ہیں جن کے لیے زندگی ہمیشہ کے لیے ہمیشہ کے لیے ذلت اور اہانت بن گئی ہوتی ہے۔ اس لئے میرے مسئلے کو اس طرح نہیں دیکھا جا سکتا۔ کیونکہ میں ایسی حیثیت میں نہیں تھا کہ جہاں بلا وجہ، غیر ضروری اور نظر انداز کی جانے والی اہانتوں کا میرے لیے انبار لگا دیا گیا۔ اس حوالے سے میں نے عدالت سے یہ کہا تھا۔ جیسے کہ میں نے یور لارڈ شپس کو بھی بتایا ہے۔ میں وہاں اس سزا کے خلاف احتجاج کرنے والا نہیں تھا جو مجھے دی جانے والی تھی۔ میں نے کہا کہ آپ یہاں انصاف کرنے کے لیے بیٹھے ہیں۔ آپ کو یہاں ایک فیصلہ دینا ہے۔ آپ جیسا فیصلہ چاہیں دے سکتے ہیں۔ لیکن آپ میری توہین کیوں کرتے ہیں! میں نے وہاں کہا، کیا یہ بھی پینل کوڈ یا ضابطہ فوجداری کا کوئی حصہ ہے کہ جب ایک آدمی پر آپ قتل کا مقدمہ چلا رہے ہوں تو پھر آپ مسلسل اسے مقدمے کے دوران بے عزت بھی کرتے رہیں!۔

اس حوالے سے میں نے میز کو بجایا تھا کہ میز بجانا عدالت کے آداب کے منافی ہے کیونکہ پارلیمنٹ میں میں ایسے کرتا رہا ہوں۔ کل یا اس سے پچھلے دن بھی میں نے غلطی سے عادت کی وجہ سے جب میں بول رہا تھا تو میز بجا دی اور بعد میں اس کی معذرت چاہی جب میں بیگم نصرت بھٹو کیس میں سپریم کورٹ میں حاضر ہوا اپنے پوائنٹ کو سامنے لانے کے لیے میں نے میز بجائی۔ مجھے علم نہیں تھا کہ قواعد کے منافی ہے اور مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں اسی لیے اس انداز سے میں نے ہائی کورٹ میں میز بجائی تھی۔ مجھے اس کا قطعی احساس نہ تھا کہ اسے عدالت کی توہین سمجھا جائے گا۔

جیسا کہ میں نے کل ذکر کیا تھا۔ میں کوئی بے جڑ مظہر نہیں ہوں۔ میرے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے۔ لوگ اس سے بہت شدت سے دکھ محسوس کر رہے ہیں لوگوں میں ایک کرب پھیلا ہوا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں ان کا رہنما ہوں۔ وہ محض یہ نہیں کہتے کہ چائے کی ایک

پیالی پی گئی تھی اور کچھ بھی نہیں ہوا۔ اور دنیا میں سب ٹھیک ہے۔ ان معنوں میں میں ہائیکورٹ میں بول رہا تھا۔ میں نے صورتِ حال کے ایک گرافک ارتقاء کو پیش کیا تھا۔ کسی صورت یا معنوں میں بھی یہ ایک دھمکی نہ تھی۔ میں نے یہ کہا تھا کہ جب مجھ پر غیر ضروری اہانتوں کی بوچھاڑ کی جا رہی ہے تو لوگ یہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔

جب میری بیوی کا خون قذافی سٹیڈیم میں بہایا گیا۔ تو لوگ دادو کے ضلع سے اور دوسری جگہوں سے آئے اور انہوں نے ہسپتال سے اس کا خون لے کر چادروں پر ڈال کر واویلا کیا کہ وہ اب ایسی چیز کا جاری رہنا کبھی برداشت نہیں کریں گے۔ یہ ان کا ردِ عمل تھا۔ جب مسز گاندھی کو حراست میں لیا گیا تو اس صدمے سے پانچ آدمی مر گئے تھے۔ اسے دو دنوں کے لیے قید کیا گیا۔ دو دن کچھ بھی نہیں ہوتے۔ لیکن لوگ مرے اور لوگوں نے گرفتاریاں دیں۔

اگر یہاں مارشل لاء نہ ہو۔ اگر کل مارشل لا اٹھا لیا جائے تو آپ دیکھیں گے کہ کیا ہوتا ہے۔ اس مارشل لاء کی وجہ سے، ان سماجی حقائق کی وجہ سے جہاں آپ کو بولنے کی اجازت نہیں۔ یہاں عوام کے ردِ عمل کو دبایا جاتا ہے۔ اس لیے میں وہاں بھی عوام کے جذبات کا اظہار کر رہا تھا کہ وہ کیا محسوس کرتے ہیں۔ میں وہاں دھمکی نہیں دے رہا تھا۔ یہ نہیں کہہ رہا تھا کہ جو راستے میں آیا ہے۔ اس سے نمٹا جائے گا۔ لیکن ہونٹ تو بہر حال خشک ہو گئے ہیں۔

مائی لارڈ، اگلا پوائنٹ جو میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ وہ اس مسئلے سے متعلق ہے کہ "مجھے یاد نہیں" "مجھے یاد نہیں" استغاثے کے گواہوں کا مقیم سانگ ہی نہیں ہے۔ جنہیں وہ بات بھی یاد نہیں رہتی جو انہوں نے دو ماہ پہلے کہی تھی۔ لیکن وہ بات یاد رہتی ہے جو تین برس پہلے کہی گئی تھی۔ ۱۸ دسمبر کو جو حکم درخواست پر دیا گیا۔ اس میں بھی یہ مقیم سانگ بدرجہ اتم موجود ہے۔

مائی لارڈ، ججوں کو کم از کم اپنی سہولت کے لیے ایک ٹیپ کا اہتمام کر لینا چاہیے تھا آخر ایک ٹیپ پر خرچ ہی کیا ہوتا تھا؟ بی بی سی ا[illegible] نمائندوں کو بتایا گیا تھا کہ احتیاط کے پیش نظر کارروائی کو ٹیپ ریکارڈ کیا گیا [illegible] ٹیپس دینے سے انکار کر دیا گیا۔

لیکن محمد بوٹا کے معاملے میں ٹیپ کا ایک حصہ عدالت میں سُنا گیا۔ تاکہ محمد بوٹا کی شہادت کی تصیح کی جا سکے۔ اگر ٹیپ کو محمد بوٹا کی گواہی کی تصیح کے لیے چلایا جا سکتا تھا تو پھر میری ۱۸ دسمبر والی درخواست کے تحت بھی اسے چلایا جانا چاہیئے تھا۔ لیکن ہمیں بتایا گیا "اس درخواست میں بہت سے حصے ہیں۔ ہم سے کیسی توقع کی جا سکتی ہے کہ ہم انہیں یاد رکھ سکتے ہیں۔ ہمیں یاد نہیں ہے۔" پانچ جج تشریف فرما ہیں لیکن انہیں یاد نہیں آ رہا ہے یہ بات محض ایک جج نے تو نہیں کہی تھی کہ اسے یاد نہیں ہے۔

مائی لارڈ، بار بار دُھرائی جانے والی یہ تھیم "مجھے یاد نہیں ہے" سے مجھے مسٹر نکسن کی یادداشتوں کا خیال آیا ہے۔ جو حال ہی میں شائع ہوئی ہیں۔ اسی کے ایک حصے میں واٹر گیٹ کی تفتیش و تحقیقات کے حوالے سے مسٹر نکسن نے کہا ہے جو خود ایک مستند وکیل ہیں۔ "کسی مصیبت یا تباہی سے جان بچانے کے آسان ترین راستہ جو کوئی شخص اختیار کرتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ کہتا ہے "مجھے یاد نہیں ہے۔" اس پر خواہ ہالڈمین یا ڈین قہقہے لگائیں۔ لیکن جب وہ کہتا ہے "مجھے یاد نہیں ہے" تو دراصل اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے "میں جھوٹ بول رہا ہوں"۔ کچھ عرصہ پہلے میں نے یہ کتاب موت کی کوٹھڑی میں پڑھی تھی۔ درستی کو مدنظر رکھتے ہوئے میرا خیال ہے کہ ہالڈمین یا ڈین میں سے کسی ایک نے اس سلسلے میں امریکہ کی سپریم کورٹ کی ایک رولنگ کا بھی حوالہ دیا تھا۔ اور صدر نکسن کو بتایا تھا اگر ایسا مشورہ اس ملبہ کو دیا جاتا ہے جو واٹر گیٹ کے اندر گیا ہے تو بھی معاملہ اس طرح "مجھے یاد نہیں" پر ختم نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ ایسے عدالت منطقی استخراج بھی کرتی ہے۔ اور "مجھے یاد نہیں" کے حقیقی معنوں تک بھی پہنچتی ہے۔

۱۸ تاریخ کی درخواست کے حوالے سے کہوں گا کہ اسے ۱۸ تاریخ کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ ۱۹ تاریخ کو جب میں عدالت جانے کے لیے تیار تھا تو مجھے بتایا گیا کہ آج عدالت کا اجلاس نہیں ہوگا۔ کیونکہ چیف جسٹس کو بعض اہم امور کے سلسلے میں راولپنڈی بلوایا گیا ہے۔ ۲۰ کو تعطیلات کی وجہ سے عدالت کا اجلاس ملتوی کر دیا گیا۔ تعطیلات کے بعد یہ درخواست واپس کر دی گئی۔ کہا گیا کہ اسے کاز لسٹ پر لے آیا گیا ہے۔ لیکن اسے

اس لیے واپس کیا جارہا ہے کہ اس میں غلطیاں ہیں۔ اس میں انتہائی معمولی تفاوت تھے۔ بہرحال ۵ رجنوری کو واپس کر دیا گیا۔

جب ۹ رجنوری کو عدالت دوبارہ کھلی اور میں اس کمرے سے نکل رہا تھا۔ جس میں مجھے عدالت کے اندر جانے سے پہلے بٹھایا جاتا تھا تو مجھے اطلاع دی گئی کہ مجھے چیمبرز کے اندر طلب کیا گیا ہے۔ میں ششدر رہ گیا۔ اور اندر داخل ہوا۔ مَیں نے پانچوں ججوں کو وہاں بیٹھے ہوئے پایا۔ وہ چیمبرز کے باہر بھی عدالت لگا سکتے تھے۔ چیف جسٹس نے میرے ہمراہ آنے والے ایس پی ظفر اللہ سے کہا کہ وہ بیٹھ جائے۔ چونکہ وہاں ایک دوسری کرسی بھی موجود تھی۔ اس لیے مَیں بھی بیٹھ گیا۔ اس نے فوراً چلّا کر مجھے اُٹھنے کے لیے کہا "تم ایک ملزم ہو، تم نہیں بیٹھ سکتے۔" چونکہ میں ایک ملزم تھا۔ اسی لیے میں بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ اس لیے مَیں کھڑا رہا۔ پھر مجھ سے پوچھا گیا کہ کیا وہ درخواست میری تھی۔ اور کیا مَیں نے اس پر دستخط کیے تھے۔ مَیں نے اثبات میں جواب دیا۔ تو کہا گیا کہ میں اس پر دلائل دوں۔

مائی لارڈ، یہاں سوال یہ اُٹھا کہ مجھے اس سے پہلے کبھی چیمبرز میں بلائے جانے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ اور مَیں نے عدالت کو کبھی چیمبرز میں بیٹھے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اور اس حوالے سے قانون کو بھی نہیں جانتا تھا۔ استغاثہ کا وکیل بھی وہاں موجود نہیں تھا۔ اور دوسرے شریک ملزمان بھی وہاں موجود نہیں تھے۔ اعتراف جرم کرنے والے ملزمان اور ان کے وکیل بھی وہاں موجود نہیں تھے۔ مجھے اکیلے ہی چیمبرز میں بلوایا گیا تھا اور اپنی درخواست پر دلائل دینے کے لیے کہا گیا۔ مَیں نے اظہار کیا کہ مَیں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں اس پر دلائل نہیں دے سکتا۔ میں اس میں ضمیمہ پیش کر سکتا ہوں۔ اس میں بعض نکات میں اضافہ کر سکتا ہوں۔ پھر میرے وکلا کو بلوایا گیا اور انہیں بمشکل پانچ یا دس منٹ سنا گیا۔ مسٹر اعوان نے دو یا تین مقدمات کا حوالہ دیا۔ جب مَیں نے بعض نکات کا ضمیمہ پیش کرنا چاہا تو مجھے کہا گیا "تم ایک عجیب شخص ہو۔ بعض اوقات تم کہتے ہو کہ اپنے وکیلوں کی ضرورت ہے۔ کبھی تم کہتے ہو کہ تم خود ہی بات کرنا چاہتے ہو۔ اپنا دماغ ٹھیک کرو۔"

میں نے ہز لارڈشپ سے پوچھا کہ تضاد کہاں پایا جاتا ہے۔ پہلے میں نے یہ کہا تھا کہ میرے وکیلوں کو آنے کی اجازت دی جائے کہ وہ قانونی نکات پر دلائل دے سکیں، اور میں بعض ضمیمہ جاتی نکات پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہوں گا۔ اس موقع پر چیف جسٹس نے ڈانٹتے ہوئے کہا، تم جانتے ہو کہ یہ موچی دروازہ نہیں ہے اور تم یہاں سیاسی تقریر نہیں کر سکتے ہو۔ میں جانتا تھا کہ یہ موچی گیٹ نہیں تھا۔ لیکن میرے اندر خواہش پیدا ہوئی کہ کاش یہ موچی دروازہ ہوتا لیکن ایسا نہیں تھا۔ یہ ہائی کورٹ کا چیمبرز تھا۔

اس وقت مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میری درخواست کس درجہ بندی اور ذیل میں آتی ہے۔ اس لیے میں نے پوچھا۔ کیا چیمبرز میں اس کی سماعت کی جائے گی؟ دوسرے لوگوں کی موجودگی میں اس کی سماعت ہونی چاہیے۔ یہ کوئی ایسا خفیہ چیمبرز کا مقدمہ نہیں ہے۔ اس پر مجھے بتایا گیا کہ یہ درخواست موشن کی درخواست ہے۔ اور اس کے ساتھ مختلف ہائی کورٹوں میں مختلف انداز اختیار کیا جاتا ہے۔ مختلف ہائی کورٹوں کا یہ وطیرہ رہا ہے کہ ایسی درخواست کی سماعت چیمبرز میں کی جائے۔ میں نے یہ نکتہ پایا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسی کئی درخواستیں موشن میں تھیں۔ بہت سی درخواستیں ایسی تھیں۔

ایسی درخواستیں ہم مقدمے کی سماعت کے آغاز سے ہی پیش کر رہے تھے اور ان سب کی سماعت کھلی عدالت میں کی گئی تھی۔ تو پھر مائی لارڈ آخر کیا وجہ تھی کہ درخواست کھلی عدالت میں نہیں سنی جا رہی تھی؟ یہ ایک بہت اہم درخواست تھی۔ جس میں مقدمے کے انتقال کے لیے درخواست کی گئی تھی۔ آخر اسے کھلی عدالت میں کیوں نہ سنا گیا؟ اور اگر سب کچھ چیمبرز میں ہی سنا جانا تھا تو پھر اسے خفیہ اور بند چیمبرز کا مقدمہ کیوں بنا دیا گیا؟

ایک اور دوسری دلچسپ چیز کا ذکر میں اس تعلق سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ وہ حکم ہے جو میری درخواست پر ۵ نومبر ۱۹۷۷ء کو جاری کیا گیا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ہائی کورٹ اس مقدمے کی سماعت مقدمے کی سماعت کے ختم ہونے کے بعد کرے گی۔ مائی لارڈ، جب ریکارڈ بھی دیا گیا تو کیا اس میں ۵ نومبر ۱۹۷۷ء کے حکم کا حوالہ دیا گیا تھا؟ سپریم کورٹ نے جو فیصلہ ۱۰ نومبر کو دیا گیا تھا۔ اس کا حوالہ دیا گیا تھا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کوئی کس طرح ۵ نومبر ۱۹۷۷ء

کے حکم کی جگہ سپریم کورٹ کے ۱۰ر نومبر ۱۹۷۷ء کے فیصلے کا حوالہ دے سکتا ہے؟ اس سے یہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ ریکارڈ کس حد تک حقیقت اور امر واقعہ کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔

مائی لارڈ، اب میں ۲۴ر جنوری ۱۹۷۸ء کی طرف آتا ہوں۔ جب سیکشن نمبر ۳۴۲ کے تحت سوالوں کے جواب دینے تھے۔ ابتدا ہی میں جب میں نے اپنی معروضات پیش کرنے کی شروع کیں تو مجھے کہا گیا کہ میں مقدمے کے ان پہلوؤں پر جو براہ راست میرے دفاع کے حامل ہیں۔ یا جن کا تعلق میری صفائی سے ہو سکتا ہے۔ کیونکہ میرا بنیادی مفاد متعصبانہ ہے۔ اس موقع پر چیف جسٹس نے کھلی عدالت میں مجھ سے وعدہ کیا کہ مجھے ان دو سوالوں پر بات کرنے کا پورا وقت دیا جائے گا۔ یعنی جب یہ آخری سوال آئے گا "آخر تمہارے خلاف یہ مقدمہ کیوں چلایا گیا"؟ اس یقین اور ان بنیادوں پر میں نے محدود انداز میں سوالوں کے جواب دیئے۔

ایک آنریبل جج نے مسٹر بھٹو سے پوچھا کہ جو کچھ ان کے ذہن میں ہے۔ وہ دوسرے سوالوں کا جواب نہیں ہے۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو: مائی لارڈ، جہاں تک میرا واسطہ ہے۔ میں نے پورے مقدمے کا ۹ر جنوری ۱۹۷۸ء کو مکمل بائیکاٹ کر دیا تھا۔ میں ہائی کورٹ میں اس لیے جانے پر مجبور تھا کہ میں آزاد شخص نہیں تھا۔ بہر حال مائی لارڈ ۲۴ر جنوری کو مجھے یقین دلایا گیا کہ مجھے عدالت کو خطاب کرنے کا موقع فراہم کیا جائے گا۔ اور میں جتنا وقت چاہوں گا بول سکوں گا۔ اور ۲۵ر جنوری کو میں نے دیکھا کہ مجھے ایک خالی عدالت میں لیجایا گیا ہے اور خفیہ ٹرائل ہو رہا ہے میں نے اپنے آپ کو قطعی طور پر مبہوت پایا۔ میں چکرا گیا۔ کوئی حکم پاس نہیں کیا گیا تھا۔ کوئی حکم دکھایا نہیں گیا تھا۔ کوئی نوٹس نہیں دیا گیا تھا۔ مجھے اپنے حقوق کی کوئی خبر نہ تھی۔ مجھے یہ بھی علم نہیں تھا کہ یہ قانونی بھی ہے یا نہیں؟ ۲۴ر جنوری کو مجھے ایک بالکل مختلف تاثر دیا گیا تھا کہ ۲۵ر جنوری کو میں نے اپنے آپ کو ایک یکسر صورت حال میں پایا۔ ایک بالکل نئی صورتحال میں پایا۔ فطری بات ہے کہ میں نے احتجاج کیا اور اپنے وکیلوں سے مشورہ کرنے کے لیے کہا اس پر ایک لمبی بحث اس مرکزی خیال پر ہوئی کہ کیا مجھے اپنے وکیلوں سے مشورہ

کرنے کی اجازت دی جا سکتی ہے یا نہیں؛ جبکہ میں نے ان کے وکالت نامے واپس لے لیے ہیں۔ سوال تو یہ تھا کہ میں اُن سے اس خفیہ ٹرائل کی قانونی حیثیت پر مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ آخر کار مجھے میرے وکلاء سے مشورہ کرنے کی اجازت دیدی گئی۔ مسٹر یحییٰ بختیار آئے۔ میں نے اُن سے کہا کہ وہ جلدی سے اِس مقدمے کی نامناسبت پر ایک درخواست لکھ کر دیں۔ میں چاہتا تھا کہ یہ درخواست میں اسی روز کوٹ لکھپت جیل واپس بھجوائے جانے سے پہلے داخل کر سکوں۔ یحییٰ بختیار نے کہا کہ وہ اس وقت مجھے کوئی مشورہ نہیں دے سکتے جب تک وہ اس حکم کو نہ دیکھ لیں۔ جس کی بنیادوں پر یہ قدم اٹھایا گیا ہے۔

ہم نے اس حکم کی نقل کے لیے درخواست پیش کی۔ یہ نقل ہمیں ۲۶ یا ۲۷ تک نہیں دی گئی۔ بلکہ یہ اس وقت دی گئی جب مجھے ۲۸ کو عدالت میں لے جایا جا رہا تھا۔ یعنی دو دنوں کے وقفے کے بعد، تب بھی مجھے اس حکم کی نقل دی گئی جو ۲۴ جنوری کو منظور کیا گیا تھا۔ اور ۲۵ جنوری کے حکم سے ان بنیادوں پر انکار کر دیا گیا کہ یہ ایک خفیہ مقدمہ تھا۔ "مسٹر بھٹو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ہم آپ کو یہ کیسے دے سکتے ہیں" مجھے بتایا گیا۔ "آپ کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ ایک خفیہ ٹرائل ہے۔"

مجھے یہ سمجھ لینا چاہیے تھا کہ یہ ایک خفیہ مقدمہ ہے۔ میں نے اپنی تفریح کے لیے یہ سمجھ لیا کہ اس سے اس لیے خفیہ رکھا جا رہا ہے کہ مجھے کچھ کہنا ہے۔ ہر وہ بات جو اقبالی شریک ملزموں نے عدالت کی کارروائی کے درمیان کہی تھی۔ جو کہ آخر تک خفیہ عدالت میں جاری رکھا گیا تھا۔ نہ صرف اس کو رپورٹ کیا گیا۔ بلکہ اس کی پبلسٹی ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بھی کی گئی۔ یہ مقدمہ بس اس حد تک خفیہ اور بند تھا۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق تھا۔ اسے اس حد تک پُراسرار اور رازدارانہ رکھا گیا کہ مجھے ۲۵ جنوری کا اوریجنل حکم بھی فراہم نہ کیا گیا۔ جس کا علم مجھے پاکستان ٹائمز میں چھپنے والی ایک خبر سے ہوا کہ ایک دوسرا حکم منظور کیا جا چکا ہے۔

مائی لارڈز، چیف جسٹس نے بی بی سی کو بتایا تھا کہ یہ مقدمہ تمام قانونی روایات کے مطابق، ان روایات کے مطابق جو برطانیہ میں معروف ہیں کے مطابق دن کی پوری روشنی

میں چلایا جائے گا۔ مائی لارڈز، میں یہ جاننا چاہوں گا کہ قانون کی معروف روایات کے مطابق چلائے جانے والے اس مقدمے کو کس طرح ایک بند اور خفیہ مقدمے میں تبدیل کر دیا گیا؟

میں نے اس پر اصرار کیا کہ عام معروف قانونی روایات کے مطابق چلائے جانے والے اس مقدمے کو بند کمرے کے مقدمے میں کسی طرح بھی تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ ہالسبری نے بھی کہا ہے۔ "کسی مقدمے کو بند کمرے کے مقدمے میں صرف چلڈرن ایکٹ کے تحت تبدیل کیا جا سکتا ہے" یا جہاں گڑبڑ کا اندیشہ ہے۔ ججوں میں سے ایک نے رائے دی، تم اس پر کیوں اصرار کر کے مطالبہ کر رہے ہو کہ اسے بند کمرے کا مقدمہ نہ بنایا جائے۔ آخر اس میں کونسی غیر معمولی بات ہے۔ وہ فیصلہ تو ہم لکھنے والے ہیں عوام تو یہ فیصلہ نہیں کریں گے؟"

مائی لارڈز، میں نے معزز جج کو جواب دیا کہ یہ ایک غیر معمولی رائے ہے جو دی گئی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ فیصلہ وہی لکھیں گے۔ لیکن کھلی عدالت میں مقدمہ کی سماعت کے لیے قانونی جدوجہد کی گئی ہے۔ مجھے یہ ہمیشہ سکھایا گیا ہے کہ انصاف میں کوئی خالقاہی صفت نہیں ہوتی۔ جو بات میں سمجھ نہیں سکا تھا۔ یہ تھی کہ مقدمے کو اچانک اور یک طرفہ طور پر اس وقت کیوں خفیہ اور بند مقدمہ بنا دیا گیا۔ جبکہ میرے بولنے کی باری آئی تھی۔

۲۴ جنوری کے حکم میں یہ کہا گیا تھا کہ چونکہ میں عدالت کے خلاف مذموم اور فحش الزام لگانے والا ہوں۔ اس لیے عدالت سماعت بند کمرے میں کرے گی۔ پوائنٹ یہ ہے کہ میں نے جو کہنا تھا وہ پہلے کہہ چکا تھا۔ اس میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اور اگر ایسا ہی تھا تو پھر مقدمے کی سماعت گیارہ اکتوبر ۱۹۷۷ء سے ہی بند کمرے میں خفیہ ہونی چاہیے تھی۔ کیونکہ میں نے تعصب کے جو الزامات لگائے تھے وہ تو اس سے پہلے عائد کر چکا تھا۔ میں تو اس تعصب کے بارے میں معروضی حقائق سامنے لانا

چاہتا تھا، تعصبات معروضی ہوسکتے ہیں۔ یہ موضوعی نہیں ہوسکتے۔ میرے بارے میں یہ کیوں فرض کر لیا گیا تھا کہ میں عدالت کو بدنام اور رسوا کرنا چاہتا ہوں۔ جبکہ میں نے ابھی ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا۔ عدالت آخر کیوں چھلانگ لگا کر اس فیصلے تک پہنچی تھی اور مقدمے کو ایک بند اور خفیہ مقدمے میں تبدیل کرایا تھا۔

مائی لارڈز، ۲۴ تاریخ کا حکم اپنے ظاہر سے ہی ناقص ہے۔ یہ حکم خود خفیہ اور بند کمرے کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔ عدالت کو اس کے بارے میں بتا دیا گیا تھا۔ اسی لیے عدالت نے ۲۵ تاریخ کو اس کے نتیجہ میں ایک نیا حکم جاری کیا۔ ایسا اس لیے کیا گیا کہ میں نے عام قوانین کے تحت بند کمرے کے مقدمات کا حوالہ دیا تھا اور کہا تھا کہ اس سلسلے میں عدالت کو گڑبڑ ہونے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔

مائی لارڈز لاہور ہائی کورٹ ایک قلعہ نما عمارت ہے۔ آپ میں سے جو حضرات لاہور میں رہے ہیں انہوں نے اسے دیکھا ہوگا۔ اس کی مکمل ناکہ بندی کی گئی تھی راستوں کی ناکہ بندی کی گئی تھی ساری جگہ میں پولیس کے آدمی زنانہ پولیس اور فوجی افسر بھرے پڑے تھے۔ حتیٰ کہ وکلاء تک کے لیے یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ وہ عدالت تک پہنچ سکیں۔ ایسی صورت میں میرے لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہاں گڑبڑ پیدا کر سکتا۔

مائی لارڈز اب یہ سپریم کورٹ آپ دیکھتے ہیں کہ جو حفاظتی اقدامات کیے گئے ہیں۔ آج میری سماعت کا چوتھا دن ہے اور یہاں آپ نئے چہرے دیکھ سکتے ہیں۔ وہ نئے ذہین وکلاء جو انگلینڈ سے واپس آئے ہیں جنہوں نے لنکنز ان اور گرے سے قانون کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ یہاں نئے چہروں کے وکیل بھی دکھائی دیتے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔ ۲۵ کے حکم میں ایک وجہ یہ بھی بیان کی گئی تھی کہ ہالسبری کے تحت کسی مقدمے کی سماعت بند کمرے میں کیوں کی جاتی ہے۔ اس لیے مائی لارڈز یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ۲۴ تاریخ کا حکم ناقص تھا۔ اور اس کے بعد ۲۵ تاریخ کا حکم درست حقائق پر مشتمل نہیں تھا۔

وہ دن کی پوری روشنی کہاں چلی گئی تھی جس میں چیف جسٹس نے مقدمہ چلانے کا وعدہ

کیا تھا۔ مقدمہ نہ صرف یہ کہ دن کی روشنی میں نہیں چلایا گیا بلکہ اس کے برعکس اسے آدھی رات کو چلایا گیا۔

حتیٰ کہ صحافیوں کو بھی مکمل طور پر ۲۷ تاریخ کو بلیک آؤٹ کیا گیا۔ ۲۶ اور ۲۷ تاریخ کو دو حکم جاری کیے گئے جن میں مجھے کہا گیا کہ میں اپنا بیان جاری رکھوں۔ مجھے سوال نمبر ۹۵ کے جواب کے لیے کہا گیا یہ اس وقت ہوا جبکہ میں ابھی اس مقدمے کی غیر قانونی حیثیت میں یقین رکھتا تھا۔ اور میں نے یہی کہا تھا کہ یہ مقدمہ بیکار ہو چکا ہے اور مکمل طور پر غیر قانونی بن گیا ہے اس مرحلے پر مسٹر جسٹس آفتاب نے مجھے کہا میں نے تم سے جو سوال پوچھا ہے اس سے تمہاری اس تقریر کا کیا واسطہ ہے۔ تم میرے سوال کا جواب دو۔

مائی لارڈز! ججوں کے لیے میرے دل میں بے حد احترام ہے۔ میں نے ہز لارڈشپ سے کہا کہ میں ان کے سوال کا جواب ان معنوں میں دے رہا ہوں کہ انہیں مجھ سے کوئی سوال پوچھنے کا حق نہیں ہے۔ میں انہیں یہ بتانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ مجھ سے یہ سوال پوچھنے کے مجاز نہیں ہیں کیونکہ اب یہ سوال بے معنی اور غیر متعلق ہو چکے تھے۔ لہٰذا میں مسکرا دیا اور مقدمے کی غیر قانونی پوزیشن پر بولتا گیا۔

مائی لارڈز! اس سے پہلے میں آپ کے سامنے اپنی معروضات کے اس ریکارڈ کا ذکر کر چکا ہوں جو میں نے ہائی کورٹ کے سامنے پیش کی تھی۔ ریکارڈ میں انہیں مسخ کیا گیا تھا۔ اب پوائنٹ یہ ہے کہ جب میں یہ کہہ رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ اسے تحریر نہیں کیا جا رہا تھا اس لیے میں نے سٹینو گرافر سے کہا۔

پلیز میں جو کچھ کہہ رہا ہوں آپ اسے قلم بند کرتے جائیں۔ تب مجھے کہا گیا سٹینو گرافر کیوں لکھیں۔ اور تم کون ہوتے ہو کہ اسے یہ کہو کہ وہ انہیں قلم بند کرے میری معروضات متعلقہ اور مستند تھیں لیکن انہیں خارج کر دیا گیا جب مجھے یہ ریکارڈ دکھایا گیا تو میں نے کہا کہ مجھے اجازت دی جائے کہ میں اسے ٹیپ کے ساتھ ملا کر چیک کر سکوں۔ بات کہنے کا یہ ایک سادہ اور واضح طریقہ تھا کہ مجھے یہ شبہ تھا کہ جو ریکارڈ تیار کیا گیا تھا وہ درست نہیں تھا۔ مجھے اس کی اجازت نہیں دی گئی اور ۷ فروری کو میں یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ اس ریکارڈ میں کئی خلا ہیں۔

اور یہ ایک نامکمل ریکارڈ ہے اور جو کچھ میں نے کہا ہے وہ پورا اس ریکارڈ میں نہیں دیا گیا۔
مائی لارڈز، میری ان معروضات کی بنیادوں پر مجھے ایک عادی جھوٹے کا نام دیا گیا۔ جبکہ اس پورے مقدمے کے دوران ایک بھی ایسا واقعہ نہیں ملتا جس میں یہ پایا جائے کہ میں جھوٹ بول رہا تھا۔ سارا ریکارڈ آپ کے سامنے موجود ہے۔ میں تو انتہائی سادہ اور واضح انداز میں یہ نکتہ اٹھا رہا تھا کہ اس میں انتہائی سنجیدہ اور خوفناک خلا موجود ہیں ان معروضات کے حوالے سے جو میں نے پیش کیں اور جنہیں ریکارڈ میں ادھورا رکھتے ہوئے پاکستان کے سابق وزیر اعظم اور صدر کو عادی دروغ گو کا خطاب دیا گیا۔
اس طرح پاکستان کو کیا عمدہ شہرت دی گئی کہ اس کا وہ صدر اور وزیر اعظم جسے عوام نے منتخب کیا تھا ایک عادی دروغ گو ہے۔ مائی لارڈز قانون کی اس عدالت میں عدالت کو کونسی ایسی وجہ مل گئی تھی کہ جس سے وہ ایسے نتیجہ تک پہنچی۔ اس حوالے سے کیا یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ججوں کے پورے بنچ کا رویہ متعصبانہ تھا۔
مائی لارڈز میں آپ کو اس معاملے میں تھکانا نہیں چاہتا کہ عدالت نے یہ اصرار کیوں کیا کہ یہ شک کے تمام فائدے استغاثے کو دیے جاتے ہیں۔ میں اپنی علالت کے کوائف اور جو میرا علاج کیا گیا بیان کر چکا ہوں لیکن اس مقدمے میں یہ نکتہ انتہائی توجہ طلب ہے کہ جب میں علالت کی وجہ سے معذور ہو گیا تو میری عدم موجودگی میں مقدمے کی کارروائی جاری رکھی گئی۔ کیا اس سے پورے بنچ کے تعصب کا مظاہرہ نہیں ہوتا۔
عدالت اس حد تک آگے بڑھ گئی کہ مجھے نام کا مسلمان قرار دیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جناب والا اگر آپ اس نام کے مسلمان کے مسئلے پر جاتے ہیں تو پھر میں ایک ایسا شہری ہوں جس کا کوئی ملک نہیں۔ کیونکہ یہ شہریت دستور میں ایک مسلمان یا اقلیتوں کو فراہم کی گئی ہے۔ یہ شہریت اس جانور کو نہیں دی جا سکتی جو نام کا مسلمان ہو۔ میں نہیں جانتا کہ اور کتنے لوگوں کو اس درجہ بندی میں شامل کر کے انہیں بے ملک بنا دیا جائے گا اور اگر ہم بے ملک لوگ بنا دیے گئے تو ہم کہاں جائیں گے۔ کینیڈا، آسٹریلیا یا ہم کسی نئے ملک کے لیے جدوجہد کریں گے۔

مائی لارڈز اس مقدمے میں جو تعصب برتا گیا ہے اس کے بارے میں خوش ہوں کہ اگر اس تعصب کے بہت سے پہلوؤں کو ابھی سامنے نہیں لایا جا سکا۔ تاہم میں اس کی وسعت کو کم کرتا ہوں۔ کیونکہ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ میں تعصب اور جھکاؤ کے اس پہلو کا انتہائی اجمالی انداز میں ذکر کروں۔ تاہم یہاں میں چیف جسٹس کے اس ذاتی اصرار کا ضرور ذکر کروں گا کہ وہ یہ چاہتے تھے کہ مجھے فی الفور موت کی کوٹھڑی میں پہنچا دیا جائے۔

مائی لارڈز، ۱۷ مارچ کو مقدمے کے فیصلے کے اعلان سے ایک دن پہلے کوٹ لکھپت جیل کا سپرنٹنڈنٹ میرے پاس رات کے وقت آیا۔ اور مجھے اطلاع دی گئی کہ کل عدالت کو میری ضرورت پڑے گی۔ کیونکہ اگلے دن فیصلہ سنایا جائے گا۔ مائی لارڈز کئی احکام سیاسی سرگرمیوں کے حوالے سے جاری کیے جا چکے تھے۔ لاہور ہائی کورٹ میں بعض انتہائی قسم کے اقدامات کیے جا چکے تھے۔ مقدمے کے فیصلے سے تین چار دن پہلے ہی فوج کو بلا لیا گیا تھا اور ایسی کئی چیزیں رونما ہو چکی تھیں جن سے پتہ چلتا تھا کہ کیا رونما ہونے والا ہے۔

اور پھر جیل میں بھی بعض واضح اشارے نشاندہی کر رہے تھے کہ ڈنمارک کی ریاست میں سب کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ فلڈ لائیٹس لگا دی گئی تھیں۔ ٹاور تعمیر کر دیے گئے تھے سائرن لگا کر انہیں دو تین مواقع پر بجایا گیا تھا تمام چیزوں کا معائنہ ہو چکا تھا۔ تو پھر جیل سپرنٹنڈنٹ میرے پاس آیا اور کچھ دیر تک وہ میرے پاس بیٹھا رہا۔ اس نے ان تمام غیر معمولی کارروائیوں کی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی جو معرض وجود میں لائی جا رہی تھیں۔ جب میں خاموش بیٹھا رہا تو اس نے مجھے تسلی دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا خدا پر ایمان رکھیں۔ میں نے جواب دیا خدا پر ہی ایمان رکھیں گے۔ اور کس پر رکھیں گے۔ جناب والا نکتہ یہ ہے کہ وہ مجھے تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا اور پھر اس نے مجھے کہا کہ اگر بدترین بات بھی ہو گئی تو بھی میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ احکام جاری ہو چکے ہیں کہ آپ کو اس کمرے میں رکھا جائے گا جہاں آپ اس وقت ہیں۔

مائی لارڈز، میں اپنے آپ کو بدترین کا سامنا کرنے کے لیے مسکرا دیا۔ کیونکہ جیل سپرنٹنڈنٹ کبھی عدالت میں نہیں گیا تھا۔ اس نے وہ آرار نہیں سنی تھیں۔ ان نشانیوں

کو نہیں دیکھا تھا جنہیں میں بہت پہلے واضح طور پر محسوس کر چکا تھا وہ سب اس آخری دن کے انتظار میں تھے جب وہ اپنی آنکھوں میں طمع اور حرص کو چھپکاتے ہوئے پھانسی پر لٹکا دیں گے اس لمحے تک جب تک جان نہ نکل جائے۔ اس لیے میں محض مسکرا دیا۔ اور خاموش رہا۔ لیکن سپرنٹنڈنٹ جیل نے اپنی بات جاری رکھی اور کہا کہ جیل کے حکام نے یہ سفارش کی ہے کہ مجھے اس جگہ رکھا جائے اور اس کی منظوری آئی۔ جی جیل خانہ جات پنجاب کے سیکرٹری داخلہ اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل سوار خاں نے دے دی ہے کہ جیل کے ضوابط کے تحت قتل کے مقدمے کے قیدی کو دوسروں سے علیحدہ رکھا جا سکتا ہے۔ اور یہ ضروری نہیں کہ اسے پھانسی کی کوٹھڑی میں بھیجا جائے۔

مائی لارڈز، ۱۷ تاریخ کو مجھے بتایا گیا کہ میری اس حیثیت کو برقرار رکھا جائے گا اور مجھے ٹھیک اسی کمرے میں رکھا جائے گا جہاں مجھے پاکستان کے صدر اور وزیر اعظم کی حیثیت سے جگہ دی گئی تھی۔

۱۸ تاریخ کو جب میں عدالت سے لوٹا تو یحیٰی بختیار مجھے ملنے کے لیے آئے۔ وہ بہت پریشان تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ پریشان نہ ہوں ابھی خدا ہمارے سروں پر موجود ہے پھر میں نے اپنے خدمت گار کے ساتھ ایک گھنٹہ یا اس سے زیادہ بیڈمنٹن کھیلا اور پھر میں سونے کے لیے چلا گیا۔ مائی لارڈز ساڑھے پانچ بجے صبح ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل ایک بہت چھوٹا اُترا ہوا اور نادم چہرہ لیے ہوئے میرے پاس آیا۔ میں نے اس کے چہرے سے ہی بھانپ لیا کہ کچھ ہو چکا ہے۔ میں نے اسے چائے کی ایک پیالی پینے کی دعوت دی۔ کیونکہ میں نے اپنے لیے ابھی چائے مانگی تھی۔ اس نے چائے پینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ ایک ناخوشگوار فرض کے لیے آیا ہے اور وہ بہت شرمندگی محسوس کرتا ہے اور اسے حکم دیا گیا ہے کہ مجھے فی الفور پھانسی پانے والی کوٹھڑی میں بند کر دیا جائے اور یہ کہ انہیں پہلے ہی اس سلسلے میں بہت تنگ کیا گیا ہے کہ انہوں نے مجھے سوا گیارہ یا ساڑھے گیارہ بجے دوپہر کو عدالت سے واپس آنے کے بعد ہی پھانسی پانے والوں کی کوٹھڑی میں نہیں بھیجا گیا۔ اور اب جیل خانہ جات کے ایڈیشنل آئی۔ جی

کو بھیجا گیا ہے کہ وہ جا کر تصدیق کرے کہ مجھے پھانسی پانے والوں کی کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا اس طرح مجھے کھینچ کر پھانسی پانے والوں کی کوٹھڑی میں لے جایا گیا۔

مائی لارڈز اگر میں نے یہ نکتہ اٹھایا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں سپریم کورٹ میں اس واقعہ سے متعلق جو بیانات دیئے گئے ہیں وہ غلط ہیں۔ یہاں کہا گیا ہے کہ مجھے تین کمرے دیئے گئے تھے جس کے ساتھ ایک صحن بھی تھا۔ اور مجھے دوسروں سے علیحدہ رکھا گیا تھا اور پھانسی کی کوٹھڑی کی اصطلاح غلط استعمال کی گئی ہے۔ جناب والا اگر ایسا تھا تو پھر مجھے اس جگہ سے منتقل کر کے اس جگہ لے جانے کی کیا ضرورت تھی۔ جسے پھانسی کی کوٹھڑی کا نام دیا جاتا ہے۔ جہاں مجھے ایک دن میں ۲۳ گھنٹوں تک مقفل رکھا جاتا تھا۔

حقیقی نکتہ یہ ہے کہ مجھے وہاں سے منتقل کیے جانے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اگر جیل مینوئل نے اتنی اہمیت اختیار کر ہی لی تھی تو بھی اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ جیل مینوئل نے کیا ملکی دستور پر فوقیت حاصل کر لی تھی۔ کسی شخص کو الگ تھلگ اور قید تنہائی میں ڈالنے کے لیے جیل مینوئل میں بعض حالات کو سامنے رکھتے ہوئے بعض ترجیحی اختیارات موجود ہیں۔ اگر یہ ترجیحی اختیارات اس شخص کے لیے بروئے کار نہیں لائے جاتے جو اس ملک کے اعلیٰ ترین عہدے پر فائز رہا۔ جو اس ریاست کا سربراہ رہا تھا۔ حکومت کا سربراہ تھا اور ملک کا رہنما تھا تو پھر اس سے کون برتر، مقدس برکات حاصل کرنے والا شخص آئے گا کہ جسے ان خصوصی اور ترجیحی اختیارات سے نوازا جائے گا!

مائی لارڈز، غیر منقسم ہندوستان میں محض نامور افراد، پیروں اور سیاستدانوں کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ انہیں موت کی سزا دی گئی۔ انہیں کبھی موت کی کوٹھڑیوں میں نہ بھیجا گیا۔ حتیٰ کہ اس صوبے میں ڈلکلاں کے ایک زمیندار کو جو نامور سر فضل حسین کا داماد تھا۔ پھانسی کی سزا دی گئی۔ لیکن اسے موت کی کوٹھڑی میں نہیں رکھا گیا۔ مجھے مائی لارڈز نہ صرف موت کی کوٹھڑی میں رکھا گیا بلکہ مجھے ہراساں اور خوفزدہ کرنے کے لیے کمانڈوز بھی بھیجے گئے۔ ۱۲ کی رات کو وہ دوبارہ آئے۔ مجھے یہ اچھی طرح یاد ہے کیونکہ

یہ علامہ اقبال کا یوم وفات تھا۔ جب میں نے اس سلسلے میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سے پوچھا تو اس نے کہا کہ مجھے کمانڈوز کے بارے میں کیسے علم ہوا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ میں ان کے بوٹوں کی آواز سن رہا تھا۔ بے چارہ سادہ لوح اپنی سادگی میں پکڑا گیا۔ مسکرا کر کہنے لگا، انہوں نے تو بوٹ اُتارے ہوئے تھے۔"

ٹھیک ہے۔ وہ مجھے پھانسی کی کوٹھڑی ہی میں پھینکنا چاہتے تھے۔ اب ان کی حرص کی تسکین ہو گئی ہو گی۔

شیکسپیئر نے اپنے ڈرامے "ٹویلفتھ نائٹ" میں کہا ہے۔

اگر موسیقی محبت کی غذا ہے۔
تو اسے بجاتے رہو۔
مجھے اس تک رسائی بخشو۔
یہ تکلیفیں، اور بھوک بیمار ہو کر
اس طرح مر جائے گی۔"

اب ان بھوک کم پڑ گئی ہے، اس کو تسکین مل گئی ہے۔ اب یہ مرتی کیوں نہیں ہے؟ کیا کبھی نہ ختم ہونے والی حرص ہے؟ اس کے باوجود ہراساں کرنے کا عمل جاری رہا۔ مئی میں مجھے راولپنڈی منتقل کر دیا گیا۔ یقین کیجیے، مائی لارڈز، میں کسی مبالغے کے بغیر کہہ رہا ہوں کہ یہ ایسا ہی تھا جیسے شیواجی کو اورنگ زیب کے خیمے میں لے جایا گیا ہو۔ جیسے میں کوئی غیر ملکی قیدی تھا۔

صحن سپاہیوں سے بھرا پڑا تھا۔ وہ ہر جگہ پر منڈلا رہے تھے۔ حتیٰ کہ برآمدوں میں بھی۔ کوریڈور غلاظت سے بھرا ہوا تھا۔ کوئی وہاں بمشکل ہی کھڑا ہو سکتا تھا۔ وہاں چھ کوٹھڑیاں تھیں۔ پھانسی اور موت کی چھ کوٹھڑیاں۔ ایک باتھ روم اور چار دوسری کوٹھڑیاں۔ ان چار کوٹھڑیوں میں مکھیاں آ جا نہیں سکتی تھیں۔ موت کی کوٹھڑی بالکل کھلی تھی اور اس میں مکھیاں کو روکنے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ موسم گرم تھا۔ گرمی پڑ رہی تھی۔ میرا سارا چہرہ مکھیوں اور مچھروں سے بھرا ہوا تھا۔ محافظوں کے کمروں تک

کو جالیاں لگی تھیں اور وہاں مکھیاں نہیں جا سکتی تھیں ۔ میں اس پر خوش ہوں مجھے بھی ایک ایسی ہی کوٹھڑی دی جا سکتی تھی ۔ لیکن مجھے ابھی تک ایسی کوٹھڑی نہیں دی گئی تھی اور ماں (لارڈز) ، باتھ مکمل طور پر کھلا تھا ۔ اور مجھ سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ جب ہر وقت وہاں اوپر سے نیچے آدمیوں کا مارچ ہوتا رہتا تھا تو میں اسے استعمال کرنے کے لیے جاؤں ۔

" ...... حتی کہ لوئر لارڈشپس میرے تحفظ کے لیے آئے ۔ میں نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا تھا ۔ یہ کسی قسم کی بھوک ہڑتال نہیں تھی ۔ یہ تو ان حالات کا نتیجہ تھا کہ میں کچھ کھا پی نہیں سکتا تھا ۔ پھر لوئر لارڈشپس نے مداخلت کی اور کچھ سہولتیں فراہم کر دی گئیں ۔ سہولتوں کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ جیسے ایک مرغی کو باتھ روم لے جایا جائے ۔ میرے کمرے میں ایک سوئچ لگا دیا جس کے ذریعے ہمیشہ روشنی رہتی ۔ کیونکہ یہ سارا وقت اون رہتا تھا ۔ ایک ٹیلی فون جو میری کوٹھڑی کے باہر نصب کیا گیا تھا ۔ اور جس کی گھنٹی ہمیشہ بجتی رہتی تھی ۔ اسے وہاں سے ہٹا دیا گیا ۔ کوریڈور میں لوگوں کی تعداد میں کمی کر دی گئی ۔ لیکن چند دنوں کے بعد مداخلت اور دست اندازی پھر سے ہونے لگی ۔ میں بمشکل ہی کوریڈور میں جا سکتا تھا ۔ جبکہ مجھے وہاں جانے کی اجازت دی گئی تھی ۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ میں باہر ہی نہیں نکلوں گا ۔

کچھ بھی ہو ، میری عزتِ نفس میرے لیے بہت اہم تھی ۔ میں اپنے آپ کو ہر طرح کی بے وقعتی کے سپرد نہیں کر سکتا تھا ۔ نہ ہی میں مسلسل شکایت کرنا چاہتا تھا ۔ لیکن جون میں جب میں بیمار پڑ گیا تو فوج کا ایک جرنل ، جرنل شوکت (جو پی پی پی سے تعلق نہیں رکھتا تھا) میرے پاس بھیجا گیا ۔ جب اس نے مجھے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ کمرہ گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا ۔ گدے کے سپرنگ ٹیڑھے میڑھے اور الٹے سیدھے ہو چکے تھے ۔ میری کمر کا معائنہ کیا گیا ۔ یہ انتہائی خراب حالت میں تھی اور اس پر زخم ۔ اس طرح بُرے برتاؤ کا سوال پیدا ہوا ۔

اس کے برعکس ساتھی شریک مجرموں کو تمام مراعات اور سہولتوں سے نوازا گیا تھا ۔ ان کا دروازہ ساتھ ہی تھا ۔ میں ان کی باتیں سن سکتا تھا ۔ ان کے خاندان آتے جاتے رہتے ۔

میں موسیقی اور قہقہوں کی آوازیں سنتا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، مجھے معمولی سہولتیں دینے سے انکار کر دیا گیا۔ مائی لارڈز، بڑے تسلسل سے یہ کہا جاتا ہے کہ کوئی بھی قانون سے بالا نہیں ہے۔ میں بھی قانون سے برتر ہونا نہیں چاہتا۔ لیکن میں اپنے قانونی حقوق چاہتا ہوں۔ میں قانون کے تابع رہنا چاہتا ہوں۔ لیکن میں قانون کے تہہ خانے میں جانا نہیں چاہتا۔ مجھے قانون کے اسی تہہ خانے میں ڈال دیا گیا تھا۔ جبکہ اقبالی شریک ملزموں کو وہ تمام سہولتیں فراہم کی گئی تھیں جو وہ چاہتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اس حوالے ایک درخواست آپ کے سامنے پیش ہوئی ہوگی۔ جس میں ۱۹ر تاریخ کو عدالت میں ان کے بڑے برتاؤ کا ذکر کیا گیا تھا۔ اس نے نہ صرف یہ کہ بدتمیزی کی۔ بلکہ اس نے کہا اور اسے لوگوں نے بھی سنا کہ انہیں ایک جھوٹے اور جعلی مقدمے میں پھنسایا گیا ہے اور اگر پولیس نے اس کے ساتھ زیادتی کی تو وہ سچ اُگل دے گا۔ اس نے یہ بات اس عدالت میں کہی تھی اور اسے لوگوں نے سنا تھا۔

آنریبل چیف جسٹس نے اس وقت بات قطع کرتے ہوئے کہا کہ شریک اقبالی ملزموں کو مسٹر بھٹو کے بیان کے خاتمے کا موقع دیا جائے گا۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں مائی لارڈز، اور میں بھی آپ کو یہ بتاؤں گا کہ انہیں یہاں کیوں لایا گیا تھا۔ اگرچہ انہیں ہائیکورٹ میں اپنی ہر بات کہنے کا دیا گیا تھا۔ اور انہوں نے جو کچھ کہا تھا شائع بھی کر دیا گیا تھا۔ چونکہ یور لارڈشپس نے مجھے یہاں بولنے کی اجازت دی ہے۔ اس لیے انہیں یہاں لایا گیا ہے کہ مجھے یہاں الگ تھلگ کر دیا جائے۔ میں یور لارڈشپس کو بتا سکتا ہوں کہ وہ قطعی طور پر یہاں کیا کہیں گے کہ ایف ایس ایف ایک دہشت گرد فوج تھی۔ وہ مجبور تھے وہ آزاد ایجنٹ نہیں تھے۔ یور لارڈشپس وہ ایف ایس ایف کے روزنامچے پیش کریں گے، وہ میرے خلاف کہیں گے اور بلاشبہ وہ رحم کی درخواست کریں گے۔

ان میں سے ایک نے جیل سے یور لارڈشپس کی خدمت میں ایک درخواست بھیجی ہوئی ہے جس میں اس نے کہا کہ چونکہ وہ خدا کی طرف لوٹ رہا ہے۔ اس لیے وہ تمام چیزوں سے اپنا سینہ صاف کرنا چاہتا ہے۔ مائی لارڈ اگر وہ خدا کی طرف ہی جا رہا ہے تو پھر وہ اس عدالت

سے زندگی کے لیے رحم کی درخواست کیوں کر رہا ہے۔ یہ تو اپنی جگہ ہی ایک تضاد ہے وہ خدا کی طرف جا رہا ہے اور چاہتا ہے کہ سچ بولا جائے۔ یقیناً وہ خدائے مطلق کی طرف نہیں جا رہا وہ کسی چھوٹے خدا کی طرف جا رہا ہے۔ جس کی "خ" چھوٹی ہے۔ اگر وہ واقعی اپنے خدا کی طرف جا رہا ہے تو پھر وہ کسی عدالت کے پاؤں میں کیوں گر رہا ہے۔ وہ اس عدالت سے رحم اور معافی کیوں چاہتا ہے۔ وہ یہ کیوں چاہتا ہے کہ اس کی زندگی کسی معصوم آدمی کی زندگی لے کر کیوں بچالی جائے؟ اگر ایسا ہی کہا جاتا ہے تو پھر یہ بھی خوب ہے!

اس کے بعد، مائی لارڈز، جیسے کہ میں نے پہلے دن کہا تھا۔ میں اس حکومت کرنے والے طبقے کی بدنیتی اور موجودہ سماجی حقیقتوں کے سوال پر آتا ہوں۔ سب سے پہلے میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے سیاسی معیار، سیاسی نمونے اس نوعیت کے ہیں کہ ہم اس پر یقین نہیں رکھتے کہ ان کے باہر بھی جایا جا سکتا ہو۔ کسی سیاسی عمل اور سیاسی جدوجہد میں ہم اس کے سکوپ اور حلقے سے باہر نہیں نکل سکتے۔ مزید براں، مجھے آنریبل ججوں نے یہ یقین دلایا ہے کہ اگر میں میرٹس کی بنیادوں پر اس مقدمے کو تباہ کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہوں تو پھر اس میں بدنیتی کا پہلو غیر ضروری ہو جائے گا اور یہ تسلیم کر لیا جائے گا کہ یہ مقدمہ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے اور یہ کہ یہ کیس اپنی کھوکھلی ٹانگوں پر بھی کھڑا نہیں ہے۔ بلکہ مٹی کی ٹانگوں پر بھی کھڑا نہیں ہے میں اس بدنیتی کے بارے میں اپنی ابتدائی معروضات کی حد سے زیادہ آگے نہیں جاؤں گا۔

مائی لارڈز، میں جانتا ہوں کہ آپ اس پوزیشن کو قبول نہیں کریں گے۔ لیکن کچھ بھی ہو میں یہ چاہوں گا آپ اس امر واقعہ کے بارے میں اپنے جوڈیشنل نوٹس کا معائنہ کریں کہ ایک منتخب حکومت کے خلاف فوج نے تختہ الٹ کر فیصلہ کر لیا۔ یہ بذات خود ایک گمان غالب ہے کہ بدنیتی کی گئی ہے۔ میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ کم از کم میری معروضات پر اتنا غور ضرور کریں کہ جب ایک قانونی حکومت جمہوری اور جائز حکومت کا تختہ الٹتی ہے۔ جب زائد آئینی دلائل دیئے جاتے ہیں۔ جب قانون معطل یا منسوخ کر دیا جاتا ہے تو پھر خود

ہی بدنیتی کی بنیادیں بن جاتا ہے۔ جہاں تک اس حکومت کرنے والے طبقے کا تعلق ہے ان کے بارے میں میں بعض حوالے دے چکا ہوں۔ جو غیر ملکی پریس اور ملکی پریس کے ریکارڈ پر ہیں۔ بعض خاص بیانات ......

اس موقع پر آنریبل چیف جسٹس نے بات ٹوکتے ہوئے اپنے خیال کا اظہار کیا کہ جہاں تک آنریبل چیف جسٹس اور ان کے فاضل رفقا کا تعلق ہے۔ وہ یہ ارادہ رکھتے ہیں کہ جہاں تک انسانی طور پر ممکن ہے اس مقدمے کا فیصلہ ریکارڈ کی بنیادوں پر کیا جائے اور دونوں طرف سے جو معروضات ان کے سامنے پیش کی گئی ہیں۔ ان کو بنیاد بنایا جائے۔ اس کا فیصلہ کسی بھی ایسے انٹرویو پر نہیں ہوگا جو غیر ملکی افراد کو دیا گیا ہو یا ملک کے اندر یا ملک کے باہر۔ آنریبل چیف جسٹس نے اس پر مزید کہا کہ وہ ایسے بیانات کو پڑھنا بھی پسند نہیں کرتے ہیں۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو:۔ میں خوش ہوں۔ مائی لارڈ، کہ آپ ایسے بیانات کو پڑھنا بھی نہیں چاہتے۔ یہ معیار کے اعتبار سے بڑے نادار بیانات ہیں اور سیاسی اصطلاحات اور اقدار اور قیمت کے اعتبار سے بھی معمولی ہیں۔ اس لیے میں خوش ہوں۔ آپ اپنا وقت ضائع نہیں کریں گے۔

مائی لارڈز، سماجی حقائق کے ہر مسئلے پر میں یہ کہوں گا کہ انتہائی، رمزیہ نازک اور متضاد دوہرے معیارات کا اطلاق کیا جا چکا ہے۔ واقعی، مجھے وہ مشہور کھیل "اینی گیٹ یور گن" یاد آ رہا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ کیا یور لارڈشپس کو یہ یاد ہے یا نہیں؟ ساری صورت حال کا خلاصہ ایک گیت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ جو "اینی گیٹ یور گن" میں ہے۔ جس میں کہا گیا ہے "جو کچھ بھی تم کرو گے، میں اس سے بھی بہتر کر سکتا ہوں۔"

یہ کہا گیا ہے کہ میں نے آئین میں ترامیم کیں اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا گیا کہ یہ ترامیم پاکستان کی قومی اسمبلی اور سینیٹ کے ذریعے منظور کی گئی تھیں۔ یہ آئینی ترمیمات تھیں۔ آج کل سپریم کورٹ کے فیصلے کی خلاف ورزی کرنے کے لیے کس قسم کی ترمیمات کی جا رہی ہیں۔ یہ ترمیمات ملک کے مفاد کے انتہائی خلاف ہیں اور ایک دن اس ملک کے ٹوٹنے کا سبب بنیں گی۔ میں جداگانہ انتخابات کی ترمیم کا خیال کر کے کانپ جاتا ہوں۔ مائی لارڈز، ہم آئین

کے چھاتے کے نیچے کام کرتے تھے۔ آج آئین کہاں ہے؟ ان ترامیم کی افادیت کہاں ہے انہیں کس طرح جائز قرار دیا جا سکتا ہے؟

مائی لارڈز، صدر یحییٰ خاں کو اس غلط اصطلاح کے ذریعے رسوا کیا گیا کہ انہوں نے ایک لیگل فریم ورک آرڈر جاری کیا تھا۔ جس کے تحت اس کا ہر چیز پر کنٹرول ہو گیا تھا۔ میں نے انہیں کہا تھا کہ جب اسمبلی معرضِ وجود میں آئی اسے اس تصویر سے نکال دیا جائے گا کیونکہ پھر اسمبلی کی حکمرانی ہو گی۔ اور پھر اس لیگل فریم ورک آرڈر ایک بیکار آلہ بن جائے گا۔ اور اس کی کوئی اہمیت باقی نہ رہے گی۔ اس طرح آج، جیسے بھی قوانین منظور کیے جا رہے ہیں آنے والی اسمبلی کے لیے ان کی کوئی اہمیت نہ ہو گی۔ اسی لمحے جب آنے والی اسمبلی اپنا پہلا ریزولیوشن یا پہلا ایکٹ اپنی خود مختاری کے متعلق منظور کرے گی۔ ہر کوئی اس تصویر سے باہر نکل جائے گا۔

اور پھر مائی لارڈز یہ کہا گیا ہے کہ میرے زمانے میں سپیشل ٹربیونل نہیں قائم کیے گئے آج کل جو ٹربیونل بنائے جا رہے ہیں وہ کس قسم کے ہیں؟ ملٹری ٹربیونل، ڈس کوالی فیکیشن ٹربیونلز، سے قطع نظر ایسے ٹربیونل بنائے جا رہے ہیں۔ جنہیں یہ اختیارات سونپے گئے ہیں کہ وہ کسی بھی سیاست دان کو سات برسوں کے لیے نا اہل قرار دے سکتے ہیں۔ ایسے ٹربیونل بھی تیار کیے گئے ہیں جہاں تفتیشی افسران کو فیصلہ کرنے والے حکام کا ایک حصہ بنا دیا گیا ہے مائی لارڈز بات یہ ہے کہ پروڈا آیا اور ریپروڈا کو ہائی کورٹ کے ججوں کے سامنے رکھا گیا۔ لیکن انصاف کی بوطیقا یہ تھی کہ جنہوں نے انہیں پروڈا کیا تھا اور جو پروڈا کیے گئے تھے۔ انہوں نے ان کو پروڈا کیا۔ جنہوں نے آئین پروڈا کیا تھا۔ اب کوئی اگر پاکستان کی روایات کو سامنے رکھے تو وہ جو دوسروں کو نا اہل قرار دے رہے ہیں۔ انشاء اللہ ان کو نا اہل قرار دیں گے۔ جنہوں نے انہیں نا اہل قرار دیا ہے۔

مائی لارڈز، اس مقدمے میں، صورت حال کی روشنی میں، مَیں ایک سیاستدان بننے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں کہ کوئی فائدہ اٹھاؤں۔ لیکن آپ سے درخواست کروں گا کہ مجھے اجازت دی جائے کہ ان امور کے حوالے سے خلاصہ پیش کروں۔ جو میرے خیال میں ان حدود سے باہر

نہیں ہوں گی جنہیں یور لارڈشپس نے خود مناسب قرار دیا ہے۔ مائی لارڈ، پہلے دن یور لارڈشپ نے یہ کہا تھا کہ پاکستان میں رائج حالات اور خطے میں رائج حالات کی اس مقدمے سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ اس لیے میں ان میں نہ جاؤں۔ لیکن اس پوزیشن کو قبول کرتے ہوئے آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ کچھ بھی ہو اپنے حکومت کے محدود تجربے کی بنا پر مجھے یہ نشاندہی کرنے کی اجازت دی جائے کہ اس وقت ہمارے ملک میں کیا رائج ہے۔ ہمارے خطے اور بین الاقوامی طور پر کیا ہو رہا ہے۔

میں یور لارڈشپس کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم انتہائی غیر محفوظ اور نازک حالات سے گزر رہے ہیں۔ میں معروضی انداز اختیار کروں گا۔ میں موضوعی رائے نہیں دوں گا۔ بلکہ معروضی کہتا ہوں کہ یہ قوم انتہائی نازک اور غیر محفوظ صورت حال سے گزر رہی ہے۔ اور اگر یہ صورت حال طوالت اختیار کرتی چلی گئی تو پھر ان بگڑتے ہوئے حالات کا حل تلاش کرنے میں اتنی ہی زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مائی لارڈز سوال یہ نہیں ہے کہ اس بحران کا حل کیا نکلے گا۔ کیونکہ بیان کی رگھسے پٹے حل موجود ہیں۔ کچھ لوگ انتخابات کی بین بجا رہے ہیں۔ کچھ گول میز کانفرنس کی۔

لیکن کسی مسئلے کے حل کو بھی حالات کے دھارے کے مطابق جانچا جاتا ہے۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد یہ حل بھی بے کار اور بے معنی بن جائیں گے۔ بعض حل، جنہیں ایران میں ایک یا دو سال پہلے بروئے کار لایا جاتا تو موجودہ صورت حال اور بحران سے بچا جا سکتا تھا۔ اس لیے بعض اوقات ایسا ہی ہوتا ہے کہ مفید اور اچھے حل واقعات کی بنا پر ہاتھوں سے نکل جاتے ہیں۔ ملک کے ٹکڑے کرنے کے بعد جنرل یحییٰ نے ملک کو ایک آئین دیا۔ یوں نکتہ یہ ہے اگر انتخابات سچے ہیں وقت کے دھارے کے تحت انتخابات سچے اور ٹھوس ہیں۔ جیسا کہ یور لارڈشپس نے اس نکتے پر اپنے فیصلے میں غور کیا ہے۔ لیکن وقت کے دھارے کے باہر مجھے وہ خوف ہے۔ اس عظیم تغیر اور انقلاب کا، جس کا ذکر نہرو نے اپنی کتاب "ڈسکوری آف انڈیا" میں کیا ہے وغیرہ وغیرہ ..... آپ جانتے ہیں کہ نہرو اس خوف کے وہم میں مبتلا تھے کہ بیس سے پچیس برس کے اندر برصغیر خون میں نہا جائے گا۔

اردگرد کے حالات کے پیش نظر، میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہم انتہائی نازک حالات سے گذر

رہے ہیں اور کسی ذاتی مفاد کے بغیر میں یہ کہتا ہوں کہ جتنی جلدی لوگوں کو حصے دار اور شریک بنایا جاتا ہے، جتنی جلدی لوگوں کو پاکستان کے عظیم دفاع کے لیے حرکت میں لایا جاتا ہے۔ کیونکہ پاکستان کا عظیم و بالا دفاع ہی اس کی وحدت ہے۔ اتنا ہی بہتر ہوگا۔ کیونکہ مارشل لا لوگوں کو ٹھوس حقائق سے محروم کر دیتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک رخنہ ہے۔ پل نہیں ہے۔ مائی لارڈ میں محب وطن کی حیثیت سے بول رہا ہوں۔ کسی فیصلے اور کسی کے فیصلوں پر کوئی الزام لگائے بغیر کہہ رہا ہوں۔ مائی لارڈ کوئی شخص لاکھوں برس زندہ اور باقی نہیں رہا۔ سیزر آئے اور چلے گئے۔ ہٹلر نے ہزاروں برسوں کی بات کی اور دس برسوں کے اندر راکھ اور ملبے کے اندر گھرا ہوا تھا۔ عوام ہی اقتدار کا سرچشمہ ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ ناگزیر ہے کہ اقتدار انہیں جلد اور کسی مزید تاخیر اور لیت و لعل کے بغیر تفویض کیا جائے۔

آنریبل چیف جسٹس نے بات ٹوکتے ہوئے یہ رائے دی کہ اس مقدمے کی حدود میں رہتے ہوئے یہ مشورہ نہیں دیا جا سکتا۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو: مائی لارڈ، میں جانتا ہوں۔ لیکن یہ فرض کرتے ہوئے مقدمہ سپریم کورٹ میں آچکا ہے۔ میں اس سازش کا بیج بو رہا ہوں۔

مائی لارڈز، اس مقدمے کو آپ کے سامنے پیش کرنے کے مقصد کے بارے میں واپس آتے ہوئے میں کہوں گا کہ یور لارڈشپس جانتے ہیں کہ انصاف ناقابل تقسیم ہے۔ انصاف مطلق ہوتا ہے۔ سیاست میں سودا بازی ہو سکتی ہے۔ کاروبار میں سودے بازی ہو سکتی ہے لیکن انصاف میں کسی طرح کی کوئی سودے بازی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہاں کوئی شخص بے خطا ہوتا ہے یا خطاکار۔ سیاست میں کوئی درمیانی راستہ اور مفاہمتی حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن قانونی اصطلاحات کے مطابق یہاں کوئی مفاہمتی سمجھوتہ یا حل نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی کوئی درمیانی حل ہو سکتا ہے۔ داخلی احساسات یا خارجی واقعات اس میں کوئی کردار ادا نہیں کر سکتے۔

یور لارڈشپس کو مشہور زمانہ کیس اینڈرسن کیس یاد ہوگا۔ اس وقت جبکہ جنگ لڑی جا رہی تھی۔ لارڈ اٹیکنز نے کیا تھا۔ اس وقت بھی جبکہ جنگ کے طبل بج رہے ہیں ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ کیا اس شخص کو رہا کیا جائے گا یا نہیں؟ یہ ایک ناموافق فیصلہ تھا۔ لیکن ایک

طاقتور نا موافق فیصلہ۔ جسے بعد میں ایک فیصلہ بننا تھا۔

یا تو میں بے خطا ہوں اور اس مقدمے کو معقول شبہات سے ماورا ہو کر، سچا ثابت نہیں کیا جاسکا۔ یا پھر میں بے خطا نہیں ہوں۔ دوسرے مسائل، غور و فکر اور حقائق اور واقعات اس میں کوئی کردار ادا نہیں کر رہے۔ مجھے یور لارڈشپس پر مکمل اعتماد ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ قانون کی عظمت اور شان و شوکت کو اونچا رکھیں گے۔ اور محض مارشل لا کی آیا بن کر نہیں رہ جائیں گے۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو:۔

مائی لارڈز مسٹر یحییٰ بختیار کو ایسے کئی مواقع ملے تھے کہ وہ شاعروں اور اشعار کا حوالہ دے سکیں۔ لیکن میں اپنا بیان ختم کرنے سے پہلے غالب کا ایک شعر پڑھنا چاہوں گا۔ جو مجھے کبھی بے حد پسند تھا۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پہ کہ آساں ہوگئیں

مجھے یہ شعر بہت پسند تھا۔ لیکن مائی لارڈز، غالب غلط کہتا ہے۔ غالب غلط ہے

یہ غلط ہے کہ مشکلیں اتنی پڑیں کہ آساں ہوگئیں۔

آساں نہیں ہوسکتیں۔ اب ان کو برداشت کر سکتے ہو۔

آساں نہیں ہوسکتیں۔

اب چونکہ یور لارڈشپس نے یہ ہدایت کی ہے کہ میں اپنی اردو بہتر کروں، تو میں اردو میں زیادہ فصیح ہونے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مائی لارڈ، جب ایک شخص موت کی کوٹھڑی میں بند ہوتا ہے تو ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں۔ جو اس سے پہلے کبھی اس پر رونما نہیں ہوئے ہوتے۔ میں نے سرائیکی زبان کو برصغیر کی ایک بہترین اور شیریں زبان پایا ہے۔ اور میں اپنی بات کا اختتام ان الفاظ سے کروں گا جو سرائیکی گیت کا حصہ ہیں۔ جن میں کہا گیا ہے

"درداں دی ماری دلڑی علیل اے"



